مرتب:
محمد ادریس خان

حق میری محبت کا ادا کیوں نہیں کرتے
تم درد تو دیتے ہو دُعا کیوں نہیں کرتے

خون دل دے کر سینچا ہے تیری یادوں کو
میری وفا کا حق تم ادا کیوں نہیں کرتے

کس سے کروں تیری بے وفائی کا شکوہ
ہم اپنوں کو تو یوں رُسوا نہیں کرتے

Email:sahirkhan_75@yahoo.com
contact: 03459148103

میری قسمت
میری کہانی

یہ کہانی میں نے اُن کے لیے لکھی ہے جنہوں نے میرے لیے قربانی دی۔

اُن کے لیے جنہوں نے محبت میں مجھ پہ جان نچھاور کر دی۔

اُن کے لیے جنہوں نے اس سخت وقت میں میرا ساتھ دیا۔

اُن دوستوں کے لیے جنہیں میری زندگی کے مطلق سوال تھے۔

جن سوالوں کا میں اُس وقت جواب نہ دے پایا۔

یہ کہانی اُن کے لیے ہے۔

اُن کے لیے جنہوں نے محبت کی اور مشکلیں جھیلیں۔

اُن کے لیے جنہوں نے محبت میں کس کی پروہ نہیں کی۔

اُن کے لیے جنہوں نے اپنا سب کچھ محبت پہ قربان کیا۔

یہ کہانی ہے اُن بڑوں کے لیے جنہوں نے محبت کو بُرا سمجھا۔

اُن بڑوں کے لیے جنہوں نے اپنی انا کو محبت پہ ترجیح دی۔

اُن بڑوں کے لیے جنہوں نے اپنے بچوں کی زندگی تک کی پرواہ نہیں کی۔

یہ کہانی ہے اُن سب کے لیے۔

میری قسمت۔۔۔۔۔

میر اوجو دبنا ،میرا جنم ہوا ،تو مرگئی قسمت۔
غم سے چور ہوا خوشیوں سے دور ہوا یہ کیسی تھی قسمت۔

ہر شب ڈراتی ہے مجھے موت کے سپنے دکھا کر۔
مگر ہرروز مجھے جینا بھی سکھاتی ہے قسمت۔

میری ہرسانس لے کر تم مجھے آزاد کرلینا۔
وہ جینا ہے موت سے بدتر جو پائے ایسی قسمت۔

مجھے ملا بہت کچھ نہ مل سکا جو چاہا تھا۔
کفن بنا کے چاہتوں کے دفنادیتی تھی قسمت۔

میں خواب دیکھ رہا تھا شہنشاوں سی زندگی کی۔
مجھے گرا کے پستیوں میں کہا یہ ہے تیری قسمت۔

ابد سے ازل تک ہرموڑِ زندگی پہ ٹوکھریں ملیں۔
میں کھیل کھیلتا رہا چال وہ اپنی چلتا رہا قسمت۔

نہ تھا نہ ہے مجھے گلا قسمت پہ اپنے خدا سے۔
لکھتا ہے ہر بشر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قسمت۔

موج در موج دل پہ غموں کی اتنی موجیں آئیں۔
جیل کے جسے خوشی سے خود بھی حیران تھی قسمت۔

غم میں ڈوبا، درد سے چُور اپنے ہجرے کے آنگن میں بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لئے منہ آسمان کی طرف کیا ہوا تھا۔ اتنا بے حس تھا کہ اگر کوئی آ کر وار بھی کرتا تو مجھے پتہ نہ لگتا۔ دل کا درد اتنا تھا کہ آنکھیں کُھلی ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، کان ہونے کے باوجود کچھ سُنائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑ چُکا تھا، سانس لینا مشکل تھا ، دل کی دھڑکن نہ ہونے کے برابر تھی۔ کہتے ہیں کہ اُن دنوں موسم بڑے مزے کا تھا، لیکن وہ تو جینے والوں کے لیے تھا، جی کے مرنے والوں کے لیے نہیں۔ میرا غم بہت ہی گہرا اور بالکل تازہ تھا۔ مجھے موسم اور لوگوں سے کیا لینا تھا۔

کچھ وقت بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ میری ٹانگیں سُن ہو رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے میں نے اُن پہ نظر دوڑائی، کہ ایک شخص نے میری ٹانگیں زور سے پکڑی ہوئی ہیں اور سر جُھکائے میرے قدموں میں بیٹھ کے رو رہا تھا۔ میں نے اُن کا سر اُٹھا کر اُن کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ جیسے ہی میں نے اُن کے چہرے کو دیکھا، میری آنکھیں غم و غصہ سے بڑی ہو گئیں، میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی، میری سانسیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے اُن سے اپنی ٹانگیں چُھڑائیں اور میں پیچھے ہو گیا۔ کیونکہ وہ ثانیہ کے ابو تھے۔ وہ بہت رو رہے تھے اور ہاتھ جوڑ کے ویسے ہی میرے پاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اُن کو مار مار کہ یہی پہ مار ڈالوں مگر مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اُٹھ سکتا۔ میرے چہرے کا رنگ غصے کی وجہ سے لال ہونے لگا تھا۔

اُنہوں نے پھر میرے پاؤں پکڑے اور بولے ''مجھے معاف کر دو بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں، میں خود تمہارے پاس آیا ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو، تم جو سزا چاہو دے سکتے ہو''۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں ان کے ہجرے گیا تھا اور ان کے پاوں پڑا تھا کہ ثانیہ کو کچھ مت کہنا تب یہ لوگ نہیں مانے تھے اب مجھ سے کیوں معافی کی اُمید رکھ کر آئے ہیں۔ میں درد و غم سے کچھ نہ بول پایا۔ شاید وہ میری آنکھیں پڑھ سکتا تو جان جاتا کہ اُس میں کیا ہے پھر وہ ایک لفظ اور نہیں کہتا اور چلا جاتا۔

ایک ہاتھ سے اپنے آنسو کو پونچھتے ہوئے کہا ''اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے وہ کہتی ہے کہ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں کیا کرتا میں مجبور تھا۔ وہ کہتی ہے کہ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کرونگی لیکن اگر تم مجھے معاف کر دو تو وہ ضرور معاف کرے گی''۔

وہ میری آنکھوں کی زبان سمجھ نہ پایا اور مجھ میں بولنے کی سکت نہیں تھی اس لیے میں نے اُن سے منہ موڑ لیا۔

وہ بولتے رہے ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں ملامت ہوں، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں، ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں بس مجھے معاف کرو۔ اگر تم معاف نہیں کرو گے ثانیہ معاف نہیں کرے گی اور پھر خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) مجھ پہ رحم کرو، میں ایسے مر بھی نہیں پاؤنگا''۔

اب ان باتوں کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا، مجھے وہ اور برداشت نہیں ہوئے، دل چاہ رہا تھا کہ اس کو دھکے دے کر نکال دوں۔

میں نے پورا زور لگایا اور اُن پہ چلاتے ہوئے کہا ''نکل جاؤ''۔

ہجرہ گھر کے پاس تھا وہاں شہزاد نے میری آواز سن لی تھی اور بھاگ کے ہجرے آیا۔ اُس نے جیسے ہی ثانیہ کے ابو کو دیکھا تو پستول نکالی اور اُنہیں لات مار کر مجھ سے دور گرایا اور کہا ''کس لیے آئے ہو یہاں سے اسی وقت چلا جا ورنہ تیری لاش جائے گی''۔

اُنہوں نے پستول کو اپنے ماتھے پہ رکھتے ہوئے کہا ''یہی تو چاہتا ہوں کہ کوئی مار دے مجھے، اتنی ہمت بھی نہیں کہ خود کو گولی ماروں''۔

شہزاد نے اُسے ایک اور لات مارتے ہوئے کہا ''دفع ہو میں تمہارے گندے خون سے اپنے ہاتھ اور اس زمین کو گندہ نہیں کرنا چاہتا''۔

وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا ''میں اسی رویئے کے لائق ہوں، مجھے جتنی سزا دی جائے کم ہے، جتنا ذلیل کرو کم ہے، میں اس لیے آیا تھا کیونکہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، مجھے پتہ ہے کہ میں معافی کے لائق بھی نہیں لیکن اگر تم معاف کر دیتے تو مجھ پہ تا مرگ احسان ہوتا اور میں چین سے مر سکتا''۔

میرے لیے فیصلہ بہت مشکل تھا، معاف کروں تو ثانیہ کو بُرا نہ لگے کہ اُس کے گناہ گاروں کو سزا دئے بغیر چھوڑ دیا اور اگر معاف نہ کروں تو خدا نہ خفا ہو جائے۔ اس وقت مجھ میں سوچنے کی صلاحیت تھی نہ کوئی فیصلہ کرنے کی۔ شہزاد میرے چہرے کو پڑھ سکتا تھا وہ سمجھ گیا کہ میں اور بھی پریشان ہو گیا ہوں۔

وہ کہنے لگا ''فکر نہ کرو اگلی بار اُن میں سے کوئی نہیں آئیگا۔ چلو گھر چلتے ہیں''۔

میں ویسے ہی کرسی میں پڑا رہا۔ وہ پاس بیٹھ کر کہنے لگا ''نہ کچھ کھاتے ہو نہ کسی سے بولتے ہو ایسا کب تک چلے گا۔ جو ہو گیا اُس کو کوئی بدل نہیں سکتا لیکن تمہیں دیکھ کر میں بھی خفہ ہوتا ہوں اور سارے گھر والے بھی خفہ ہیں۔ چلو گھر چل کے کچھ کھاتے ہیں مجھے بھی بھوک لگی ہے''۔

میں وقت کو واپس نہیں لاسکتا مگر اُس وقت کی کچھ یادیں میں اپنے الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جو کہ جاگیر دار ہیں اور جس کے پورے گاؤں میں بہت عزت ہے۔ہم ایک بڑے سے گھر میں تین خاندان رہتے تھے۔ہم،تایا ابو اور دوسرے چچا۔ہمارے خاندان میں تایا ابو سب سے بڑے تھے اس لیے ہر فیصلہ وہ کرتے تھے اور وہ فیصلہ آخری ہوتا تھا۔گھر میں کافی لوگ تھے سب سے بہت پیار ملا،ہم عمر بچے بھی بہت تھے اس لیے بچپن بہت اچھا گزر رہا تھا۔خوش قسمتی سے اچھے گھرانے میں پیدا ہوا مگر بدقسمتی سے اپنے مرضی سے بولنے کا نہ اپنے لیے کچھ کرنے کا حق ملا۔وہ حق صرف تایا کو تھا اور کوئی بولتا تو اُس کی بات نہیں سُنی جاتی تھی۔اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ میں خوش قسمتی سے بدقسمت ہوں۔تایا شائد اپنے ابو پہ گئے تھے جو کہ ہٹلر کی قوم سے تھا خود تو کسی کی مانتے نہیں تھے مگر دوسروں سے سب کچھ منوا لیتے تھے۔تایا کے علاوہ ابو بھی بہت سخت تھے،اُن کو غصہ بہت جلدی آتا ہے۔میرے ابو شائد اپنے امی پہ گئے تھے جو کہ ہلاکو خان کی قوم سے تھیں۔اُن کے پاس ڈنڈا ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا اور ایسے مارتے تھے کہ مُردا بھی درد سے اُٹھ کر بھاگ جائے اور اتنے وار چلاتے تھے کہ کوئی مشین گن نہ پائے۔میں کوئی چھوٹی غلطی کرتا اور مار بہت پڑتی تھی۔امی اور چچیاں بچانے آتیں وہ بھی بیچ میں ایک دو کھا لیتی تھیں۔دوسرے چچا اس لحاظ سے اچھے تھے۔میری امی اور دو چچیاں مجھے اتنا پیار کرتے تھے کہ مجھے اُن سختیوں کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔

بچپن سے بہت شرارتی تھا اور ہم عمر بچوں کو مارتا رہتا تھا۔گھر کے علاوہ محلے کے سارے بچے مجھ سے تنگ تھے۔کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھے کچھ کہتا۔لیکن جب شرارت زیادہ کرتا اور کوئی زخمی ہو جاتا تھا اور ابو یا تایا کو پتہ چل جاتا تو میری مہینوں کی شرارت ایک دن میں نکال دیتے تھے۔لیکن بچوں سے تو شیطان نے بھی پناہ مانگی ہے تو کیسے شرارت کو چھوڑ سکتے ہیں۔شرارت بچپن کا ایک اہم حصہ ہے اور مجھے یہ حصہ زیادہ ملا تھا۔جب سکول جانے لگا تو سارا بچپنا پانی میں ڈوب گیا۔ہنسنے کودنے سے پڑھنے پڑھانے میں وقت گزر جاتا تھا۔بچپن ہی سے قیدیوں سی زندگی شروع ہوئی۔جیب خرچ تایا دیتا تھا کیونکہ سارے گھر کا سرمایہ اُن کے پاس ہوتا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ سکول سے دل لگ گیا اور پھر کبھی ۹۰ فیصد سے کم نمبر نہیں آئے۔سکول کی شروعات گاؤں سے کی مگر اچھی تعلیمی معیار نہ ہونے کی وجہ سے کچھ ہی جماعتیں پڑھ کر اپنے ضلع کے بڑے سکولوں میں سے ایک سکول 'نیو اسلامیہ پبلک ہائی سکول چارسدہ' میں تبادلہ ہوا۔سکول کے بس کے ساتھ میری بات کی۔اُس بس میں اتنے لڑکے تھے کہ مشکل سے بیٹھنے کا موقع ملتا۔سب نئے لڑکے،نئے چہرے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔نہ شرارت کرتا نہ کسی سے لڑتا۔تب سے کچھ وقت کے لیے شریف بچہ بن گیا۔

اس سکول میں شروعات کچھ اچھی نہیں ہوئی۔سکول کا پرنسپل کلاسوں پہ چکر لگاتا رہتا تھا۔میرا پہلا دن تھا اور مجھے اُس کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور کتاب کو منہ میں پکڑ کر بورڈ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی نے زور سے گردن پہ دے مارا۔جیسے گردن پہ آسمانی بجلی گری ہو اور موبائل کی طرح وائبریشن پہ لگ گیا۔اور کارٹون کی طرح سر کے اُوپر چھڑیاں چکر لگا رہی تھی۔

دیکھا تو پرنسپل تھے۔وہ کسی ڈراونے خواب میں بلا جیسے لگ رہے تھے۔کہنے لگے "کتاب پڑھنے کے لیے ہوتا ہے منہ میں پکڑنے کے لیے نہیں"۔

یہ کیسے لوگ ہیں یار اِنہیں مہمان کی قدر ہی نہیں ہے۔اس پرنسپل کے ظلم و جبر کے واقعات کافی مشہور ہیں کئی لڑکوں کے ہاتھ پیر توڑ چکے ہیں۔اُسی دن سے اُن سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور آج بھی جب اُنہیں دیکھتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے کئی دوست بنے جس کی وجہ سے میری شرارتیں شروع ہو گئیں اور اُن میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔لڑکے مجھ سے تنگ آنے لگے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی پرنسپل سے میری شکایت کرتا۔اس سکول میں میرا وہ دن یادگار رہتا جس دن میں شرارت کی وجہ سے مار نہ کھاتا تھا۔

ایک بار جب میں اور میرے کچھ دوست بریک میں برف پانی کھیل رہے تھے اور پورے سکول میں بھاگ دوڑ جاری تھی کہ اچانک پرنسپل نازل ہوئے سب اپنے آپ کو بچانے کے لیے بھاگے۔باقی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے سوائے ایک کے،جب پرنسپل نے اُس کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُس کی شلوار اُن کے ہاتھ آئی۔لڑکا آگے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور پرنسپل اُس کو پیچھے کھینچ رہا تھا۔اس رسا کشی میں رسی ٹوٹ گئی۔پرنسپل نے شرم سے اُسے چھوڑ دیا اور وہ بھاگ بھاگ کے باتھ روم گیا اور ناڑا ڈال کے واپس آیا۔یہ واقعہ دیکھ کر اتنا ہنسے تھے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہو گیا تھا اور وہ بے چارہ شرم کی وجہ سے مر رہا تھا۔

میری شرارتیں بس میں بھی تھی۔ٹیچر تک جو بس میں ہمارے ساتھ جاتی تھی مجھ سے تنگ ہوتی تھی۔میری ساری توجہ شرارت کی طرف تھی مجھے صاف ستھرہ رہنے کی عادت نہیں تھی۔میں لڑکوں کو دیکھتا تھا کہ کس طرح وہ سج سنور کر سکول جایا کرتے تھے۔بال مختلف سٹائل سے کنگھی کیے ہوئے،پرفیوم لگائے ہوئے،جوتے چمکائے ہوئے۔میں سوچتا تھا کہ اِن کو کیا ملتا ہے ایسے ہی اپنا وقت ضائع کرتے ہیں سکول ہی جا رہے ہیں کونسا اِن کو کسی نے شو پہ بلایا ہے۔میں تو صبح جیسے بالوں میں اُٹھتا اُنھیں بالوں میں سکول جاتا تھا۔جوتے پہن کر شلوار سے رگڑ کر صاف کرتا اور کپڑے گندے ہونے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔دانت ایسے جیسے پان کھانے والے کے ہو مگر کیوں اور کس کی پرواہ کرتا۔گھر والے کہتے

تھے بال کنگھی کرو، صاف کپڑے پہن لو، دانت صاف کرواور جوتے ہمیں دو ہم پالش کر لیں مگر میں کہتا کہ نہیں کوئی ضرورت نہیں۔روز پرنسپل سے مار پڑتی کہ جوتے پالش نہیں ہیں ، ناخن نہیں کاٹے، کپڑے گندے ہیں مگر اس کی عادت پڑ گئی تھی۔بس میں میرے کئی اچھے دوست بنے جن میں ایک احتشام نام کا لڑکا تھا۔وہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور میں اُس کے ساتھ ہماری دوستی کافی اچھی تھی۔ہمارے سکول کے دو سیکشن تھے ایک لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا۔لڑکیوں والے حصے میں لڑکے پانچویں کلاس تک ہوتے تھے اُس کے بعد اُنہیں لڑکوں والے حصے میں بھیج دیا جاتا۔ہر لڑکا لڑکیوں کے سیکشن میں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں صبح کی اسمبلی نہیں ہوا کرتی تھی، نہ صفائی دیکھی جاتی تھی۔چاہو تو بال بڑے کرو، ناخن بڑے کرو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔پانچویں جماعت پاس کر کے ہمیں لڑکوں والے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ہر ایک کی طرح میں بھی خوش تھا کہ چلو اُن مصیبتوں سے تو جان چھوٹ گئی۔

چھٹی کلاس کے شروع میں ہی مجھے ایسے دو دوست ملے کہ جنہوں نے قسم کھائی ہوئی تھی کہ نہ خود پڑھیں گے اور نہ کسی کو پڑھنے دینگے اور اُن کے اس جال میں میں پھنس گیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا جو تھوڑا بہت شوق تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔وقت آنکھ جھپکنے کے ساتھ ہی گزر گیا اور پہلے ٹرم کا امتحان سر پہ آ گیا۔ہر ایک پرچہ توقعات سے بھی زیادہ خراب ہوا اور میتھس جو کہ مجھے شروع سے بہت بُری لگتی تھی وہ تو بالکل خالی دے دیا۔جب پرچے چیک ہوئے تو میرا میتھس کا پرچہ ٹیچر سے گم ہو گیا تھا۔پرچہ تو خالی تھا اور مجھے ایک موقع مل گیا تھا کہ میں کچھ کروں۔

میں نے ٹیچر سے کہا کہ ''میں نے تو پرچہ اچھا کیا تھا مجھے اپ اچھے نمبر دیں''۔

ٹیچر نے کہا ''کبھی کلاس میں تو ٹھیک جواب نہیں دیا مجھے لگتا ہے کہ تم نے کچھ گڑبڑ کی ہے''۔

میں نے معصومیت سے کہا ''نہ سر میں ایسا کیوں کرتا۔میں نے تو ٹھیک کیا تھا''۔

ٹیچر نے سر کجاتے ہوئے کہا ''میں ایک بار پھر گھر پہ دیکھوں گا''۔

میں دعا کرنے لگا کہ وہ اِن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔اگلے دن جب ٹیچر آئے تو وہ پرچہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ایک ایک لڑکے کو دکھایا کہ ''دیکھو کیا اس میں کچھ لکھا ہوا ہے؟'' سب خالی پرچہ دیکھ کر کہتے کہ ''نہیں''۔

ٹیچر مجھ پہ تنز کرتے ہوئے بولے ''تم نے تو کہا تھا کہ میں نے اچھا کیا ہے۔کیا جادو کے پین سے لکھا ہے جو نظر نہیں آ رہا؟''۔

سب مجھ پہ ہنسنے لگے۔میں بہت شرمندہ تھا۔

وہ بھی ہنسنے لگے اور کہا ''میں نے تو سوچا کہ یہ غلطی سے خالی پرچہ آ گیا ہے اس لیے میں نے الگ کر کے الماری پہ رکھ دیا''۔

میں نے سر نیچا کیا ہوا تھا۔کیونکہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔مجھے احساس تھا کہ میں نے غلط کیا مگر جو سر نے مجھے ذلیل کیا اُس سے مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے اگلی بار بھی نہ پڑھنے کا ارادہ کیا۔

ہمارا خاندان کافی بڑا تھا سارے بچے بھی بڑے ہو گئے۔جس کی وجہ سے بڑا گھر بھی چھوٹا لگنے لگا۔تایا نے فیصلہ کیا کہ تینوں بھائی الگ الگ گھر بنا لے۔اس لیے ہمیں الگ ہونا پڑا۔ایک گھر تین میں تقسیم ہو گیا لیکن ہمارے دل ویسے ہی جوڑے ہوئے ہیں۔اس تقسیم سے میرا ایک نقصان ہوا کہ جب پرانے گھر میں ابو مارتے تھے تو سب مل کر چھڑا لیتے تھے اور یہاں چھڑانے کے لیے وہ لوگ تھے جو خود ابو سے ڈرتے تھے۔اس پہلے ٹرم کے امتحان میں میں بُری طرح فیل ہوا۔یہ میری زندگی کی پہلی ناکامی تھی۔اُس دن میں نے گھر سے بھاگنے کا سوچا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ اگر ابو کو پتہ چل گیا تو ویسے بھی مجھے گھر میں نہیں چھوڑیں گے اور ساتھ میں اتنا ماریں گے کہ جتنا ایک دہشتگرد کو پولیس والے مارتے ہیں۔اس لیے بھاگنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ کم از کم مار سے تو بچ جاؤنگا۔سکول میں ایک گندہ اُصول تھا کہ نتیجہ صرف والدین لے سکتے ہیں مگر میرے ابو نتیجہ لینے سے پہلے میری جان لے لیتے۔اس ڈر سے میں نے نتیجے کے بارے میں گھر بتایا ہی نہیں۔سکول میں بار بار کہنے کے باوجود کہ ''گھر والوں کو بلاؤ''، نہ بُلایا، تو مجبوراً گاؤں کے ایک لڑکے کو بلوا کر قسم دی کہ یہ نتیجہ صرف اس کے گھر والوں کو ملنا چاہئے۔میری لاکھ منت سماجت کے باوجود اُس نے قسم نہیں توڑی۔میں نادم ہو کر گھر گیا اور اُس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ کب وہ لڑکا نتیجہ لائے گا اور ابو مجھے مار مار کر گھر سے نکالیں گے۔مغرب کی نماز کے بعد کسی نے گھنٹی بجائی۔میں نے دروازہ کھولا اور کیا دیکھا کہ موت کا فرشتہ حاضر ہے۔میں نے اُسے اُس وقت بھی منع کیا مگر وہ ابو کو بلوانے پہ تُلا ہوا تھا۔میرا دماغ گھومنے لگا کہ اب کیا ہوگا۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زمین پھٹ رہی ہو اور میں اندر گھُس رہا ہوں یا جیسے قیامت آنے والی ہو۔میں صحن میں ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی سوکھا درخت ہو۔ابو کی آواز آ رہی تھی زور زور سے کہ رہے تھے ''اُس کُتے کی تو میں کھال اُدھیڑ دونگا''۔

وہ کمینہ تو چلا گیا مگر مجھے مصیبت میں ڈال دیا۔ پھپھوں کو جیسے ہی بھنک پڑی کہ میں نے کچھ گڑ بڑ کی ہے تو جلدی سے مجھے بچانے کے لیے آئیں۔ مجھے لے جا کر کمرے میں چھپا دیا۔ مگر ابو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ بہت مشکل سے اُن کو روکا گیا۔ میں ڈر کے مارے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ ابو اپنے کمرے میں چلے گئے اور اس طرح قیامت ٹل گئی۔ ابو میرے فیل ہونے پہ ناراض تھے اس لیے کئی دن بات نہیں ہوئی لیکن کچھ دنوں میں سب کچھ معمول پہ آ گیا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ گاڑی میں کسی کو بھی پتہ نہیں چلا۔

مجھے چاہئے تھا کہ میں اس سے سبق سیکھتا اور اُن دو کمینوں سے دور رہتا مگر خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ اس لیے مجھ میں بھی اُن کی عادات آنی شروع ہو گئی تھیں۔ پڑھائی مکمل چھوڑ دی تھی اور مستیاں زوروں سے ہونے لگی تھیں۔ دوسرے ٹرم کے امتحان میں بھی فیل ہوا مگر اس بار ڈرائیور کو چاچا بنا کر لے گیا اور نتیجہ لیا اس لیے گھر تک بات نہیں گئی۔ میں بگڑتا گیا اور مجھے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میری غنڈا گردی شروع ہو گئی اور گاڑی کا میں بادشاہ بن گیا تھا۔ گاڑی میں اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی جو کہ میرے لیے خالی رہتی تھی۔ لڑکیوں کو تنگ کرتا اُن کا مزاق اُڑاتا۔ ایسا تھا کہ جیسے سکول نہیں جا رہا ہوں بلکہ کسی ٹرپ پہ جا رہا ہوں جہاں صرف مستی اور مزاق ہو۔ ٹیچرز اور پرنسپل مار مار کہ تھک گئے مگر میں سُدھرنے والا نہیں تھا۔ فائنل امتحان میں نقل وغیرہ کر کے مشکل سے پاس ہونے والے نمبر لے آیا۔ یہ میرے لیے بڑی کامیابی تھی۔ ہم ساتویں جماعت میں ہوئے اور کمینوں کی جھنڈ میں اِضافہ ہوتا گیا۔ فائنل امتحان کے بعد جو چھٹیاں تھی وہ پاس ہونے کی خوشی میں خوب مزے سے گزاریں۔ نہ غم، نہ پریشانی، نہ درد، نہ ڈر۔ چھٹیاں ختم ہوئیں اور نئے سال کے ساتھ ہی ہماری نئی کلاسیں شروع ہو گئیں۔ نئی مستیاں، نئی بدمعاشیاں۔

میں معمول کے مطابق صبح اُٹھا، ناشتہ کیا، یونیفارم پہنا اور بس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ آج دل کچھ زیادہ اُچل رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ اچھا ہونے والا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اُس کی زبان کو سمجھنا چاہا مگر وہ آج کوئی نئی زبان بول رہا تھا۔ دل کی دھڑکن بدل گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ چاہتا ہے کہ آج کوئی نئی مستی کروں۔ بس آئی لڑکوں سے ملا، اپنی جگہ بیٹھا، کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ بس چلنے لگی اور آگے جا کر ایک نئے سٹاپ پہ رک گئی۔

مجھے پتہ لگ گیا کہ بس میں اور لڑکے بھی آ گئے "او! نہ یار اور آبادی"۔ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ سارے بس والے شور مچانے لگے۔

احتشام نے ڈرائیور سے کہا "اس میں اور جگہ کہاں ہے؟ اور یہ تو دو ہیں"۔

میں نے بھی ڈرائیور پہ آنکھیں نکالتے ہوئے کہا "دیکھو نا ایک لڑکا اور اُس کے ساتھ۔۔۔۔ (میرا منہ کھلا ہی رہ گیا)۔۔۔۔لڑکی"۔

احتشام کہنے لگا تھا کہ "اب یہ کہاں بیٹھے گی"۔

میرا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ کم عمر اور عشق اور پیار کی باتوں سے بے خبر، مگر کیا پتا تھا کہ یہ بے خبری میں ہی آتی ہیں۔ سُنا تھا کہ پہلے پیار ہوتا ہے، پھر محبت اور جب وہ انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو پھر عشق ہو جاتا ہے۔ اُس لڑکی کو دیکھتے ہی کچھ ایسا محسوس ہوا کہ مجھے سیدھا عشق ہو گیا ہے اور جیسے میں اس دنیا سے نکل کر کہیں اور چلا گیا ہوں۔ اس نے اپنے زلفوں کو کھلا چھوڑا ہوا تھا جس نے مجھے خیالوں میں کھونے پر مجبور کر دیا۔ بادِ صبا کی وجہ سے اُس کی زلفیں چہرے پہ آ رہے تھے جسے وہ بار بار ہٹا رہی تھی۔ اُس کے زلفوں میں ایسی سیاہی تھی کہ اُس کے سائے میں سونے کا من کر رہا تھا۔ اُس کی انکھوں کی گہرائی دیکھ کر اُس میں ڈوب جانے کا من کر رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں میں ایسی سُرخی تھی کہ جس پہ رنگ جانے کا من کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پہ ایسی معصومیت تھی کہ جس پہ مر جانے کا من کر رہا تھا۔ میں انجان، حیران و پریشان کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ سکول کے گاڑی پہ چھڑی اور میں عشق کے۔۔۔۔

بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی اور نئے ہونے کی وجہ سے کوئی اُن کو جگہ دینے والا نہیں تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے سامنے والے سیٹھ سے لڑکوں کو اُٹھایا اور اُنہیں بیٹھنے کا کہا۔ میں کبھی گاڑی میں چُپ نہیں بیٹھا تھا ہر وقت مزاق اور مار پیٹ۔ مگر آج اُسے دیکھنے سے فُرصت ملتی تو کچھ بولتا پورا راستہ میں اُس کو چپکے چپکے دیکھ رہا تھا۔ لڑکے بار بار پوچھتے کہ طبیت تو ٹھیک ہے کیوں آج ایسا چپ چپ اور پریشان بیٹھا ہوا ہے۔ نہ بول رہے ہو نہ مستی کر رہے ہو۔ واقعی یہ ایک معجزہ تھا کہ میں چپ بھی تھا اور مستی بھی نہیں کر رہا تھا۔ جب میں بولتا تھا تو کسی کو بولنے نہیں دیتا تھا اور جب مستی کرتا تھا تو سب دور دور بھاگتے تھے مگر آج مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے زندگی کے سارے مستیاں کہی کھو گئی ہو۔ وہ ہماری ہی سکول میں تھی سکول پہنچتے ہی میں بھاگ کے گیا بیگ کلاس میں رکھا اور یہ دیکھنے آیا کہ وہ کونسی کلاس میں ہے۔ میں نے اُس کا پیچھا کیا شائد وہ سمجھ گئی تھی اس لیے اُس نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے کلاس میں چلی گئی۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتویں جماعت میں تھی مگر لڑکیوں کے سیکشن میں۔ اُس دن بہت افسوس ہوا کہ جب لڑکیوں کے سیکشن میں تھا تو کچھ نہیں تھا اور جب وہاں آیا تو سب کچھ ہو گیا۔

مجھے کیا ہونے لگا تھا۔ دل کیوں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ مُرجھا گیا تھا۔ بدن کانپ رہا تھا۔ دوست بولے ملیریا ہے مگر یہ تو لویریا تھا۔ ایک دن میں مجھے اتنا کچھ ہو گیا تھا

تو آگے کیا ہوگا۔ میری زندگی بدلنے لگی تھی تب سے ہر روز صبح بال کنگھی کر کے، دانت برش کر کے، جوتے پالش کروا کے، کپڑے صاف، استری کروا کے اور پرفیوم لگا کے سکول جاتا تھا۔ گھر والے بھی پریشان دوست بھی پریشان کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔ مگر میں نے کسی کو شک ہونے تک نہیں دیا۔ کچھ دنوں تک تو یہ ڈرامہ چلتا رہا۔ نہ کسی سے بولتا تھا نہ کوئی مستی کرتا، گھر میں بھی چپ چپ رہتا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اُس سے بات کروں، اُسے کیسے سمجھاؤں کہ میں اُس کے لیے کیا محسوس کر رہا ہوں۔ اگر میں اپنے دل کی بات اُسے جلد از جلد نہ بتاؤں تو یہ بات میرا دل پھاڑ کے باہر نکل آئے گی۔

کچھ دن بعد یہ پتہ چلا کہ جو لڑکا اُس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اُس کا کزن ہے۔ میں نے یہ سوچ کہ رکھا کہ پہلے اُس کے کزن کے ساتھ دوستی کرونگا اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ بھی دوستی ہو جائے گی۔ اُس کا نام جلال تھا اور آٹھویں جماعت میں تھا۔ روزانہ کسی نہ کسی بہانے جلال کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ بہت ہی اچھا انسان ہے اور کچھ ہی دنوں میں اُس سے اچھی دوستی ہوگئی۔ اس سے اُس کے کزن کے بارے میں بھی معلومات ملتے رہے۔ اُس کا بھی اُسی نے بتایا ''ثانیہ''۔ اُس کا نام سیدھا میرے دل پہ لگا اور جیسے چاقو سے مستقل طور پر لکھ دیا گیا ہو۔ میری مستیاں دوبارہ معمول پہ آ رہی تھی۔ جلال اور میں ایک دوسرے سے کافی خوش تھے۔ وہ دوستی اور اُس کے معیار کے عین مطابق تھا۔ بس میں پورے راستے ثانیہ کو چپ چپ کے دیکھتا تھا۔ اور جب اُس کی نظر مجھ پہ پڑتی تو میں اپنی نگاہ جلدی سے دوسری طرف کر دیتا تھا۔ اُس کو شک تھا کہ میں اُسے پسند کرتا ہوں اور میں اسے یقین میں بدلنا چاہتا تھا مگر اُس میں ابھی وقت تھا۔ وقت گزرتا گیا اور میری جلال سے دوستی اچھی سے اچھی ہوتی گئی۔ کم عرصہ میں جلال میرا سب سے اچھا دوست بن گیا۔ مگر ابھی تک میں نے اُسے ثانیہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں زیادہ تر وقت ثانیہ کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اُسے امپرس کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا دل جیتنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا کیا کروں کہ وہ مجھ پہ فدا ہو جائے۔ نہ وہ کسی سے زیادہ باتیں کرتی تھی نہ کسی سے مزاق کرتی تھی۔ اُس کے روئے کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا۔ اگر میں اُس سے بات کروں اور سیدھا سینڈل نکال کر مارنا شروع کرے۔ تو میری عزت کی تو واٹ لگ جائیگی۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ اپنانا تھا کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹی بھی نہ ٹوٹے، اور ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔ وقت میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا اور میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک دن میں نے ہمت کر دی۔

میں نے اُسے بُلاتے ہوئے کہا ''ثانیہ''۔

ثانیہ میرے طرف مڑتے ہوئے ''جی!''۔

میں بولنے لگا تھا کہ جیسے میری زبان اٹک گئی ہو۔ منہ ہلا رہا تھا مگر آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ سمجھی کہ میرا مزاق اُڑا رہا ہے۔

ثانیہ غصے میں بولی ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

میں نے اپنے آپ کو ایک تھپڑ مارا کہ ہوش میں آ جاؤں اور کہا ''غلطی ہوگئی میں تو کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔''۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی ''تم کچھ نہیں کہہ رہے تھے بس میری طرف منہ بنا رہے تھے''۔

میں نے ڈرتے ہوئے کہا ''نہیں ایسی بات نہیں ہے میں تو انگلش کی کاپی مانگ رہا تھا۔ میری والی گم ہوگئی ہے۔ کل ٹیسٹ ہے یاد کرنا ہے''۔

وہ سختی سے بولی ''نہیں ملی گی بس''۔

اتنے سخت جواب کے بعد مجھے بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کسی سے بات کرتے ہوئے کبھی اتنا ڈر مجھے نہیں لگا تھا۔ اتنے غرور میں تو بادشاہ نے بھی کبھی غلام سے بات نہیں کی ہوگی۔ ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ مرچی سے تیز اور کریلے سے کھڑوی ہے۔ ہر کوئی ہماری طرف متوجہ تھا۔ اب تو سارے کہیں گے کہ میری بے عزتی ایک لڑکی کے ہاتھوں ہوگئی لیکن کسی نے میرے ڈر سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے چپ رہنے میں بھلائی سمجھی۔ انگور کھٹے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ تب تک انتظار کرنا چاہئے جب تک اس کا رویہ نرم نہ ہو جائے۔ میں نے اس پہ کام شروع کیا کہ ایسا کیا کروں جس سے یہ مچھلی میرے جال میں پھنس جائے۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ کوئی عام مچھلی نہیں تھی۔ یہ شارک مچھلی سے خطر ناک اور ویل مچھلی سے بڑی تو اس کو قابو میں لانا کوئی بچو کا کھیل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس معاملے میں صبر سے کام لینے کا سوچا۔

میرے زندگی سے جیسے پڑھنے کا نام و نشان ہی مٹ گیا تھا۔ ایک طرف کمینوں کی جھنڈ تو دوسری طرف کمبخت عشق۔ اور تب سے ہر ایک پرچہ پاکستان سٹڈیز کی طرح ہوتا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے ثانیہ بڑی ہوتی گئی اُس سے زیادہ خوبصورت ہوتی گئی۔ اُس کی زلفوں کی سیاہی سیاہ ہوتی گئی، اُس کے آنکھوں کی گہرائی گہری ہوتی گئی، اُس

ہونٹوں کی سُرخی اور سرخ ہونے لگی تھی، اُس کی چہرے کی معصومیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُس کے اس بڑھتے ہوئے حُسن کو کسی کی نظر نہ لگے اس لیے وہ نقاب پہننے لگی۔ جس میں اُس کی آنکھیں خوب نمایاں ہوگئی جو میرے قتل کے لیے کافی تھی۔ میں بے چین ہو رہا تھا کہ کب میں اُسے کہونگا کہ میں اُسے پسند کرتا ہوں اور وہ کہے کہ مجھے تو اس بات کا کب سے انتظار تھا۔ میری یہ محبت کی کہانی بہت مدھم جا رہی تھی۔ جیسے سلوموشن میں فلم لگی ہو۔

جلال کے ساتھ دوستی کرنا ثانیہ کی وجہ سے تھا مگر بعد میں اُس کے ساتھ اتنا قریب ہونا اُس کا اپنا کردار، اُس کی اپنی شخصیت تھی۔ اُس کی اچھائی نے مجھے اُس کے اتنے قریب آنے پہ مجبور کیا۔ اُس کا دل شیشے کی طرح صاف تھا، بہت سادہ تھا۔ اُس کی شخصیت پانی کی طرح تھی جس سانچے میں ڈالو ویسا روپ اختیار کر لیتی تھی اس لیے میں نے اُسے دوستی کے سانچے میں ڈال دیا۔ اسی سانچے میں وہ ہیرے کی طرح چمک اُٹھا اور لوہے سے زیادہ مضبوط ہوا۔ بس میں ہر وقت جلال کے ساتھ رہتا تھا تو باقی دوست بار بار کہتے تھے یار تم ہمیں بھول گئے ہو نیا دوست جو مل گیا ہے۔ میں اُن کو بتاتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے میں اب بھی ویسا ہی ہوں مگر اب وہ بولنے والی اور مستی والی عادتیں زیادہ نہیں رہی اس لیے تم لوگوں کو ایسا لگ رہا ہے۔ جلال کو ثانیہ کے بارے میں بتانا تھا مگر سیدھا نہیں کہہ پا رہا تھا اس لیے میں نے اُسے اشاروں میں سمجھانا شروع کیا۔

میں نے کہا "اگر تمہاری کزن کسی کو پسند آجائے تو کیا کرو گے؟"

جلال نے غیرت میں آتے ہوئے کہا "پسند سے تو میں نہیں روک سکتا لیکن اگر کچھ کہا تو ہاتھ پاؤں توڑ دونگا"۔

میں نے دوسرا سوال کیا "اور وہ بھی کرے تو؟"

اب کے بار وہ تسلی سے بولا "پہلے تو ایسا ہو نہیں سکتا اور اگر ہوا بھی تو تب وہ گھر والوں کا کام ہے"۔

میں کہتے کہتے رُک گیا "اور اگر۔۔۔۔"۔

ماتھے پہ شکن لاتے ہوئے پوچھا "اور اگر کیا؟"

مجھے تو پتہ کرنا تھا کہ جلال میرے بارے میں کیا سوچتا ہے اس لیے کہہ دیا "اگر مجھے پسند آگئی؟"

سوچا اور پھر ہنس کر بولا "مزاق نہ کرو یار"۔

میں نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اگر سچ ہو"۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اُس پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "خوشی سے اُس کا ہاتھ تیرے ہاتھوں میں دے دونگا۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا"۔

میں نے چہرے پہ سنجیدگی لاتے ہوئے کہا "ایسا ہی ہے"۔

اُسے یقین ہوگیا کہ مجھے ثانیہ سچ میں پسند آگئی ہے۔

اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ "اگر میرے بس میں ہوتا تو بغیر کسی جھجک کے اُسے تمہارے نام کر لیتا مگر وہ گھر کی لاڈلی ہے سب اُس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس لیے اُس کی شادی اپنوں میں کرانا چاہتے ہیں تاکہ نظروں کے سامنے رہے۔ اس لیے اُس کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع مت کرو۔ یہ سوچو کہ وہ کسی اور کی ہے"۔

میں نے منہ بناتے ہوئے پوچھا "کسی کے ساتھ منگنی ہوئی ہے کیا؟"۔

جلال نے جواب میں کہا "ابھی نہیں مگر جلد ہو جائے گی"۔

میں خوش ہوگیا کہ چلو ایک موقع ہے اُسے پانے کے لیے اور وہ میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میری خوشی میرے چہرے سے ظاہر ہوئی تو جلال نے کہا "اتنا خوش مت ہو تم اُس سے بات تک نہیں کر سکتے"۔

جلال کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے میں حیران ہو کہ بولا "وہ کیسے؟"۔

وہ اُنگلیوں سے گنتے ہوئے بولا "ایک تو وہ خود سخت مزاج ہے اور دوسری یہ کہ اُن لوگوں کی نظریں اِس پہ ہوتی ہیں اور۔۔۔۔۔"۔

اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے "کون اُس کی نگرانی کرتا ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا"۔

تفصیل میں بیان کرنے لگا "میں سمجھاتا ہوں۔ ثانیہ کے گھر والوں کو اس کی ہر ایک آہٹ کی خبر ملتی ہے۔ وہ کیا کرتی ہے، کہاں جاتی ہے، کس کس سے بات کرتی ہے"۔

میں تھوڑا سوچ کر بولا ''کوئی جاسوسی کرتا ہے کیا؟''۔

اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''پہلے تو مجھے لو، مجھے پڑھنے کا شوق نہیں مگر وہ اکیلی تھی اس لیے اُنہوں نے مجھے ساتھ میں کرا لیا اور کبھی کبھی خود بھی چکر لگواتے ہیں''۔

میں نے کہا ''کس کو زیادہ پرواہ ہے اُس کی''۔

انداز ہ لگاتے ہوئے ''ہمارے ایک چچا ہیں۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ بہت سادہ ہیں مگر مجھے تو وہ پاگل لگتا ہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی سے لڑتے رہتے ہیں اور پستول تو ہر وقت اُس کے پاس ہوتی ہے''۔

مجھے جاسوسی کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ جاسوس تو اپنا بندہ تھا۔ بس مجھے اب اُس کے دل میں اپنی جگہ بنانی تھی۔ اُس کے قریب جانے کے لیے مجھے کچھ جادو کرنا تھا۔ میں کئی کھیل کھیل چُکا ہوں مگر اس کھیل میں میں نیا تھا۔ مجھے وقت کے مطابق چلنا تھا۔ کیونکہ وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ تھا۔ ذرہ سی دیر یا غلطی کی اور سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا۔

اگلے دن میں سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ جلال آیا بولا ''کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں تو انکار کیا کہ ''نہیں!''۔

میں نے اُس کے گالوں کو پکڑتے ہوئے کہا ''مگر کیوں نہیں کرنا چاہتے؟''

وہ میرے ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے بولا ''میں تمہیں مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا''۔

اس بار اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''کچھ نہیں ہو گا بس جیسا میں کہوں ویسا کرنا پڑے گا''۔

اُسی طرح میرے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا ''ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ تم نہیں جانتے نہ ثانیہ کو نہ ہمارے خاندان والوں کو۔ اگر کسی کو بھی پتہ چلا تو تمہیں کیا مجھے بھی مار دینگے''۔

میں نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا ''اس لیے تو تمہیں کہہ رہا ہو کہ میری مدد کرو اُسے جاننے کے لیے، ویسے تم ڈرتے بہت ہو اپنے خاندان والوں سے''۔

وہ ماننے والا نہیں تھا یا شاید اُسے سچ میں میری فکر تھی ''دیکھ یار مجھے بہت اچھا لگے گا کہ تم اور ثانیہ ایک ہو مگر اس وقت، ایسے حالات میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے اور یہ اس دنیا میں ناممکن ہے۔ خوابوں کی دنیا سے باہر آ ؤ''۔

اُس کے اس جملے کے لہجہ سے مجھے خطرے کی زبردست بو آئی اور یقین ہو گیا تھا کہ یہ جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے مگر میں اُس کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور ہنستے ہو کہا ''کیا تم نے نہیں سنا کہ خواب بھی سچ ہوا کرتے ہیں''۔

اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''پاگل مت بنو یہ ایسا ہے کہ جیسے تم شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال رہے ہو''۔

میں بھی ڈھیٹ تھا اپنی بات منوانی تھی ''اگر شیر دوست بن جائے تو جو مرضی اُس سے کرواؤ''۔

اُس کو غصہ آنے لگا تھا ''مگر بھوکا شیر دوستی کا لحاظ نہیں کرتا۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہو گا کہ فطرت نہیں بدلتی''۔

میں پیار سے بولا ''پیار سے ہو سکتی ہے''۔

وہ غصہ میں بولا ''خُدا کے لیے یہ پیار، محبت کی باتیں ذہن سے نکال دو اور اگر اب تم نے ایک بھی بات اُس کے بارے میں کہی تو میری تمہاری ساتھ لڑائی ہونے والی ہے''۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اب ماننے والا نہیں ہے اس لیے بات کو ختم کر دیا ''اچھا یار نہیں کرتا اب خوش''۔

ثانیہ کے لہجہ سے اور جلال کی باتوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ واقعی یہ بہت مشکل ہے۔ مگر فرہاد نے تو عشق میں پہاڑ کھود دی تھی، انارکلی پیار میں زندہ در گور ہوئی تھی، اور مجنوں نے محبت میں لاکھوں پتھر کھائے تھے مگر اُنہوں نے تو ہار نہیں مانی تھی۔ اگر میں ہار مان تو یہ میرے عشق کی رسوائی ہوئی۔ میں نے ثانیہ کے ہر ایک حرکت پہ نظر رکھنا شروع کیا اور ایسا موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ جہاں میں اُس کے لیے کچھ اچھا کروں اور اُسے اچھا لگے تا کہ اس کے لہجہ میں نرمی پیدا ہو۔

میں نے ایک منصوبہ بنایا اور اُس کے بارے میں جلال کو بھی بتایا۔

جلال راضی نہیں تھا ''میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھ سے اس بارے میں بات مت کرنا''۔

میں اصرار کرنے لگا ''صرف ایک بار مجھے اُس کے قریب جانے دو اگر پھر بھی کچھ نہ ہوا تو میں وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی ایسا نہیں کہونگا۔ کیا تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے ؟''

آخر مانتے ہوئے ''تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ ہو جائے گا''۔

میں خوشی سے اُچھلنے لگا اور اُس کے گلے لگ گیا۔

معمول کے مطابق سکول کی چھٹی ہوئی اور سب بس کا انتظار کر رہے تھے اور ہر روز کی طرح ثانیہ کا بیگ جلال کے پاس تھا۔ وہ اُس کو گاڑی پہ لے جایا کرتا تھا۔ مگر آج ہم نے ایک تبدیلی کی۔ اُس بیگ کو جلال وہاں جان بوجھ کر چھوڑ دے گا۔ ہم گاڑی میں بیٹھنے لگے تو جلال کے پاس بیگ نہیں تھا اس لیے ثانیہ نے پوچھا کہ ''بیگ کہاں ہے؟''

جلال ''تمہارے پاس نہیں ہے؟ میرے بازوں میں موچ آئی ہوئی ہے تو میں نے ایک لڑکے سے کہا تھا ساتھ لانے کے لیے''۔

ثانیہ غصے کے انداز میں ''کیا مطلب کسی کو کہا تھا؟ جلدی دیکھوں رہ نہ گیا ہو''۔

جلال ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے ''او! شائد وہ بھول گیا ہے۔ رکو میں اُس کے پاس دیکھتا ہوں''۔

ثانیہ دانت بجاتے ہوئے ''جلدی دیکھو ایسا نہ ہو بس چل پڑے''۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس لیے میں گاڑی سے اُترا اور جلال سے کہا کہ ''میں جا کر وہاں دیکھتا ہوں''۔

میں ثانیہ کو دیکھنے کے لیے تیز دوڑا۔ جلال آگے جا کر ایک لڑکے سے بہانے سے بات کرنے لگا اور اُس نے پلین کے مطابق ڈرائیور سے جانے کے لیے کہا۔ میں نے بیگ اُٹھایا اور ایک طرف چپ کے کھڑا ہو کر بس کے روانہ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا اور بس چل پڑی۔ تب جلال ثانیہ کے پاس آیا اور کہا کہ ''بیگ نہیں ہے''۔

ثانیہ غصہ سے لال ہو رہی تھی۔ جب میں نے یہ سب دیکھا اور بس کچھ فاصلے پہ ہو گئی تو میں بس کی طرف بھاگنے لگا۔

جلال نے ثانیہ سے میرا کہا کہ ''وہ تو رہ گیا ہے''۔

ثانیہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ دیکھو! آ رہا ہے، گاڑی روکو''۔

سب لڑکوں نے مجھے دیکھا اور شور مچا دیا کہ بس روکو ایک لڑکا رہ گیا ہے۔ بس رکی، میں چڑھا اور میں زبردستی زور زور کے سانسیں لے رہا تھا۔ بیگ جلال کو دے دیا۔

جلال نے ثانیہ کو سنانے کے لیے کہا ''واہ! بھئی تم نے تو کمال کر دیا اگر تم نہیں ہوتے تو آج تو یہ بیگ رہ جاتا''۔

پھر جلال نے ثانیہ سے کہا ''اس کا شکریہ ادا کرو اتنا بھاگا ہے تمہارے لیے''۔

آنکھیں جھکائے ہوئے ثانیہ نے کہا ''شکریہ!''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا 'کوئی بات نہیں'۔

ثانیہ کو جلال پہ غصہ تھا اس لیے اُسے سنانے لگی ''اگر تم بھولتے نہیں تو یہ نوبت نہیں آتی۔ لاپرواہی کی بھی خد ہوتی ہے''۔

جلال نے مجھے آنکھ مار کر کہا ''ویسے یار تمہیں کس نے کہا تھا جانے کے لیے، تم کیوں گئے تھے اگر رہ جاتے تو کتنی تکلیف اُٹھانی پڑتی''۔

جلال اپنا کردار اچھی طرح نبھا رہا تھا۔ اُس کی بات پہ ہنسی آئی مگر ظاہر نہیں کی اور کہا ''مجھے اچھا لگتا ہے جب میں کسی کی مدد کرتا ہوں''۔

جلال ڈایلاگ بولتا گیا ''تم بہت اچھے ہو یار میں تیرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑونگا''۔

یہ بات اُس نے بہت عجیب انداز میں کہی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ ڈرامہ نہیں کر رہا بلکہ دل سے کہہ رہا ہے۔

میں نے جواب میں کہا ''نہ یار اتنا بھی نہیں یہ تو تمہارا پیار ہے۔ اگر سچ میں اتنا اچھا ہوتا تو (ثانیہ کو دیکھتے ہوئے) کسی اور کو بھی سمجھ جانا چاہئے تھا''۔

میں نے ثانیہ کے آنکھوں میں اپنے لیے تھوڑی نرمی دیکھی جو کہ ہمارے مشن کی کامیابی کا ثبوت تھا۔ جب وہ گھر گئی اور پڑھنے کے لیے بیگ کھولا تو اُس میں ایک گفٹ اور ساتھ میں ایک خط تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کس نے رکھا ہے۔ یہ میں نے اُس وقت رکھا تھا جب میں بیگ لینے کے لیے گیا تھا۔ اس کے بارے میں جلال کو بھی پتہ نہیں تھا۔

خط میں لکھا تھا ''سلام، میں نے بہت سوچا کہ تمہیں اپنے دل کا حال بیان کروں مگر تمہارے سخت روئے سے مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کچھ کہہ نہ دو اور سارا کھیل بگڑ نہ جائے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ تم نے مجھے پہلے نظر میں پاگل جو بنا دیا۔ تم سے پہلے میری زندگی ایسی تھی جیسے اندھیری رات۔ جس میں خوف وخراص ہوتا ہے، تنہائی ہوتی ہے

اکیلا پن ہوتا ہے۔ایک ویران کھنڈر کی طرح میرا دل بھی اُجڑا ہوا تھا۔مگر ایک دن میری زندگی بدل گئی۔جب کہیں سے سورج کی کرنیں نظر آئیں۔مجھ میں خوشی کی لہر دوڑ پڑی اور میں اُن کرنوں کی طرف چل نکلا۔تاکہ وہ کہیں غائب نہ ہو جائے اور میں اُنہیں دن کے اُجالے میں بدل ڈالوں۔مگر سامنے سے مشکلات کے پہاڑ نظر آئے اور درد کا بڑا سمندر مگر میرا حوصلہ اُن سے بھی بُلند ہے۔بس اُن کرنوں سے التجا ہے کہ وہ غائب نہ ہو بلکہ میرا ساتھ دے۔جب تک ہم ساتھ ہونگے تو کوئی روکنے کی کوشش تک نہیں کرسکتا۔

گستاخی معاف!

میں جواب کا منتظر ہوں ضرور دینا۔''

اگلے روز جواب ملا مگر کچھ اور شکل میں۔جلال نے مجھے گفٹ واپس دیا اور اس کے ساتھ خط بھی اور کہا کہ

''صرف تمہیں نہیں بلکہ مجھے بھی دھمکی ملی ہے۔اور ہاں تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم نے اُسے یہ کچھ دیا ہے''۔

میں نے شرم سے آنکھیں نیچے کیئے۔

جلال غصہ میں تھا ''وہ آگ ہے اُس سے مت کھیلو جل جاؤ گے''۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا ''اگر ہر پروانہ عشق میں جل سکتا ہے تو میں کیوں نہیں''۔

وہ بولا ''وہ کتابیں باتیں ہیں''۔

اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''مگر میں سچ کہ رہا ہوں''۔

وہ اور بھڑک اُٹھا ''اپنے آپ کو سزا مت دو''۔

میں نے کہا ''سزا تو تب ہوگی جب اُسے چھوڑ دوں''۔

جلال نے مجھے سمجھانا چاہا ''وہ نہیں مانے گی تم مان جاؤ''۔

لیکن میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا ''میں نہیں مگر وہ ضرور مانے گی''۔

وہ کہنے لگا ''تم بھی اُس کی طرح ضدی ہو''۔

میں بولا ''میں اُسے ضد سے نہیں بلکہ پیار سے پانا چاہتا ہوں''۔

وہ جانے لگا کہ ''میں اور بحث نہیں کرسکتا''۔

میں نے بھی کہا ''اُس کی ضرورت بھی نہیں ہے''۔

میں ایک طرف گیا اور خط کھول کے دیکھا تو اُس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ

''سورج ہر روز خود ہی نکلتا ہے۔آج تک اُسے نہ کوئی روک پایا ہے نہ روک پائے گا اور نہ اُسے نکلنے میں کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔بس تم اُس سے دور رہنا ایسا نہ ہو کہ اُس کی حرارت سے تم جل جاؤ''۔

مجھے ان الفاظ سے اتنا درد ہوا جتنا کہ سارا جسم چُھری سے کاٹنے سے بھی نہ ہو،اتنا جلا کہ کوئی آگ جلا نہ پائے،اتنا رویا کہ آنسو سمندر سما نہ پائے،اتنا روٹھا کہ ساری دنیا منا نہ پائے۔جلال ٹھیک کہتا تھا کہ وہ بہت ضدی ہے اور ساتھ میں تو مغرور بھی ہے۔چھٹی میں جب گاڑی میں آئے تو میں نے اُسے دکھانے کے لیے وہ گفٹ پھینک دیا۔اُس نے دیکھا مگر ایسے انداز سے کہ اُسے کیا فرق پڑتا ہے۔لڑکوں نے کہا اوئے کیا پھینکا،مگر میں نے جواب نہیں دیا۔میں بہت پریشان تھا اور مجھے آگے کیا کرنا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔روز بہ روز میری پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔گھر میں اکیلے کمرے میں بند رہتا تھا نہ کسی سے بات کرتا تھا۔شدید گرمی میں بھی بند کمرے میں بیٹھا رہتا تھا اور گرمی کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔نہ کسی کے ساتھ بیٹھتا تھا۔بس تنہا بیٹھ کے روتا رہتا تھا۔مرنے کی دعا کرتا تھا۔اپنے آپ کو مختلف سزائیں دیتا تھا۔آنکھیں ایسی جیسے خون میں بگوئی ہو،دل ایسا جیسے دھڑک ہی نہ رہا ہو،سانسیں ایسی جیسے آخری ہو۔میری آواز کسی نے کئی ہفتوں سے نہیں سُنی تھی۔سکول جانا کم کر دیا تھا جب جاتا بھی تھا سر جکائے ہوئے بس میں بیٹھا ہوتا تھا۔میری خاموشی کا سب پہ اثر پڑا کوئی بس میں مستی نہیں کرتا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ ساری مستی مجھ سے شروع ہوتی تھی اور مجھ پہ ختم۔جلال کے علاوہ میرے ایسا ہونے کی وجہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔

جلال نے بہت کوشش کی کہ مجھے پھر سے ویسا ہنستا مسکراتا بنا دے مگر اُس کی کوششیں نا کام رہی۔ میری حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ لوگ باتیں کرنے لگے اور کسی نے تو یہ بھی کہا کہ مجھ پہ کسی جن کا سایا ہے۔ جلال بھی میرے لیے پریشان ہونے لگا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ میں اس حد تک جا سکتا ہو کہ جینا چھوڑ دونگا۔ اتنے دنوں میں میں نے گاڑی میں سر اُٹھایا ہی نہیں تھا نہ ثانیہ کو دیکھا تھا۔

جلال کہتا تھا کہ ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس عشق نے تمہیں بہت درد دیا ہے۔ اور میں اس درد کو سمجھ نہیں سکتا''۔

اور میں کہتا تھا ''عشق کر، بہت کر اور اتنا کر کے بھول جا۔ تب جا کر میرے اس درد کو سمجھو گے''۔

جب بھی ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہم ایک رسم نبھاتے جیسے ہندوستان میں ہولی منائی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں ایک دوسرے پہ رنگ ڈالے جاتے ہیں تو یہاں سیاہی۔ اس دن پر سب سے زیادہ مستی میں کرتا، رنگ برنگ سیاہی لاتا اور ہر ایک پہ ڈالتا خواہ وہ لڑکی کیوں نہ ہو۔ ایک اُستانی تھی اُس پہ بھی بہانے بہانے میں ڈال لیتا تھا۔

مگر اس مرتبہ تو میرے دل پہ ایک گہری چھوٹ لگی ہوئی تھی۔ مستی کرتا بھی تو کیسے۔ گاؤں جاتے ہوئے ایک نہر راستے میں آتا ہے، پچھلے سال میں نے وہاں بس رکھوا کر احتشام اور کچھ اور دوستوں کے ساتھ مل کر لڑکوں کو اُس میں پھینکا تھا۔ اور جو پانی سے ڈرتا تھا اُسے بار بار ڈبویا۔ مگر اس بار نہ چھٹیوں کی خوشی نہ مستی کا دل۔ لیکن قسمت نے کچھ اور طے کیا ہوا تھا۔ میں لڑکوں سے دور دور بھاگتا تھا کہ کوئی مستی نہ کریں۔ سب کے کپڑوں کے رنگ سیاہی سے بدلے ہوئے تھے سوائے میرے۔ اس لیے احتشام اور کچھ دوستوں نے مجھے نہر میں گرانے کا منصوبہ بنایا۔ جب نہر آئی اور سب میرے سوا اُترے تو کچھ نے میرے ہاتھ اور کچھ نے پاؤں پکڑے، باقی ہنس رہے تھے۔ میں نے بہت کہا کہ ایسا نہ کرو مگر اُنہوں نے جُھلا کر پانی میں پھینک دیا۔ جب میں پانی میں گرا اور پورا ڈوبا تو مجھے اپنا آپ ہلکا محسوس ہوا اور جب پانی سے نکلا تو ایسا لگا کہ جیسے میرے سر سے سارا بوجھ، میرے دل سے سارا غم اور ساری پریشانی بہہ گئی۔ میں تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ مگر مجھے تو اُن دوستوں کا احسان چکانا تھا۔ تب ایک ایک کو پکڑ کر پانی میں اتنے غوطے لگوائے کہ اُن کو اپنے کام پہ پچھتانا پڑا۔ ڈرائیور نے جانے کا کہا اور سب بس پہ چڑھے۔

مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر جلال خوش ہوا اور کہا ''تم مسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہو''۔

میں نے مسکراہٹ میں جواب دیا ''کیا کروں مسکراہٹ راس نہیں آتی''۔

وہ کہنے لگا ''بس کوشش کیا کرو''۔

ثانیہ کو دیکھتے ہوئے جو کہ سر جھکائے ہوئے تھی ''مگر کچھ لوگوں کو ہمارے مسکراہٹ سے نفرت ہے''۔

وہ سمجھ گیا اور کہا ''جو لوگ خود نہیں مسکرا سکتے اُنہے ہی دوسروں کے مسکرانے سے نفرت ہوتی ہے''۔

سوچ کر میں بولا ''اگر ایسا ہے تو مجھے ایک چیز کی قربانی دینی پڑے گی''۔

جلال خیران ہوا کہ ''کیا مطلب؟''۔

میں نے کہا ''اگر میں اس گاڑی میں رہونگا تو اُسے دیکھ کر میں مسکرا نہیں پاونگا۔ اس لیے مجھے بس بدلنا ہوگی''۔

وہ پریشانی سے بولا ''مطلب تم نے جانے کا فیصلہ کر دیا''۔

شوچتے ہوئے ''شائد؟''۔

وہ خفہ ہونے لگا ''اور مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا''۔

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ''اصل میں بات یہ تھی کہ۔۔۔۔۔۔''۔

مگر وہ میری بات کاٹ کر بولا ''بات کچھ بھی نہیں ہے تم نے مجھے کبھی دوست سمجھا ہی نہیں۔ گفٹ دیتے ہوئے بھی نہیں پوچھا اور اب بھی تو ٹھیک ہے جو مرضی کرو''۔

میں سر جھکائے ہوئے بولا ''نہیں ایسی بات نہیں ہے''۔

وہ تیز آواز میں کہنے لگا ''تو بتا کیسی بات ہے۔ مجھے کچھ نظر آتا تو کچھ نہ کچھ بتا دیتا''۔

میں نے اُسے گلے لگایا اور کہا ''میں یہاں خوش رہ نہیں پاؤنگا''۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور کہا ''اگر ایسی بات ہے تو ضرور جاؤ کیونکہ مجھے تو خوشی ہوگی کہ تم خوش ہو، چاہے جہاں بھی ہو۔بس یاد آئے گا یار''۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میری طبیعت کچھ حد تک ٹھیک ہوگئی تھی۔چھٹیوں میں محلے کے دوستوں کے ساتھ مشغول رہا۔جلال سے ملتا رہتا تھا۔بس کچھ نہ کچھ کر کے وقت گزار لیتا تھا۔مگر پھر بھی مجھ پہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔جلال ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ اپنے ہجرے بھی لے کر گیا تھا۔جہاں پر جلال کے ابو، ثانیہ کے ابو اور اُس پاگل چچا سے بھی ملاقات ہوئی اور یہ لوگ تب سے مجھے جانتے تھے۔ہمارے خاندان والوں کے ساتھ اُن کی جان پہچان پہلے سے تھی۔

ابو بھی میرے حال پہ کچھ افسردہ تھے اس لیے اُنہوں نے کمپیوٹر خرید کے دیا کہ شائد اُس سے میں بہلا رہوں۔تب سے کمپیوٹر سے گہری دوستی ہوئی تھی۔یہ میرے تنہائی کا واحد دوست ہے۔میرے غم مٹانے میں میری مدد کرتا ہے، وقت گزارنے کا موقع دیتا ہے۔مگر اس کے باوجود سکون نام کی چیز مجھے نہ آئی۔تب توجہ دین کی طرف ہوئی اور نماز پنجگان باجماعت پڑھنے لگا۔دل مطمئن تھا، ابو خوش تھے اور میں جی رہا تھا۔چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے دوسرے بس والے سے بات کی اور چھٹیوں کے بعد سے اُس کے ساتھ جانے لگا۔

چھٹیوں کی وجہ سے میرے دماغ سے زیادہ تر باتیں مٹ گئی تھیں مگر چھٹیوں کے بعد سکول جانے پر یادیں پھر سے تازہ ہوتی گئیں۔جو بُھلانے پہ نہ بُھولے اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے یہ مجھے پتہ نہیں۔میرے مطابق مجھے دوسرے بس میں خوش ہونا چاہئے تھا مگر یہاں بھی حالات نہیں بدلے۔اگر فرق تھا تو یہ کہ یہاں کوئی پرواہ کرنے والا نہیں تھا۔کوئی پوچھتا نہیں تھا کہ چپ کیوں ہو، کیا ہوا ہے۔بس ایک ہی سوچ ہر وقت اور اس سوچ نے میری دنیا جو بہت وسیع تھی سمیٹ کر ایک ایسے بند کمرے تک محدود کردی جہاں نہ روشنی آتی ہو نہ ہوا۔میں اگرچہ صحت سے تھوڑا کمزور تھا لیکن کسی معاملے میں ہار نہیں مانتا تھا۔مگر پتہ نہیں اس معاملے میں اتنی جلدی ہار کیسے مان لی؟ مجھے چاہئے تھا کہ میں اُس کا سامنا کرتا اور اُس کے ہر ایک سوال کا جواب دیتا۔سکول میں جلال سے جب ملتا تو اُس کے بارے میں پوچھتا کہ وہ کیسی ہے، خوش ہے کہ نہیں۔پہلے تو وہ کہتا کہ ٹھیک ہے مگر ایک دن کہا کہ یہ تو میں تمہارے دل رکھنے کے لیے کہتا سچ یہ ہے کہ جب سے تم گئے ہو میں نے بھی اُس سے بات تک نہیں کی۔

اور اُس نے مجھے ایک دن کہا کہ ''وہ آج کل کچھ پریشان سی رہتی ہے''۔

میں نے پوچھا کہ ''کیوں کچھ مسلہ تو نہیں ہے؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا ''ہو بھی تو کیا کر سکتے ہیں؟''

میں نے جلدی سے کہا ''پوچھ کہ تو دیکھو''۔

وہ مرجھاتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولا ''ٹھیک ہے ملی تو پوچھونگا''۔

میں سوچنے لگا کہ کیا وجہ ہوسکتی ہے اگر گھر میں مسلہ ہو تو جلال کو پتہ ہونا چاہئے اور اگر بس میں کچھ ہوا ہے تو تب بھی اُسے پتہ ہونا چاہئے۔آخر بات کیا ہوسکتی ہے؟۔

مجھے رات کو نہ نیند آئی نہ چین، یہ کیسی محبت تھی اتنا ٹکرانے کے باوجود میں اُس کے لیے اتنا پریشان ہو رہا ہوں۔دل میرا تھا مگر دھڑکن اُس کے لیے تھی، دماغ میرا تھا مگر سوچیں اُس کے لیے تھی، جسم میرا تھا مگر سانسیں اُس کے لیے تھی۔اگلے دن جلال میرے پاس آیا اور کہا کہ ''کل میرے پوچھنے سے پہلے اُس نے خود بتا دیا''۔

میں نے بے چین ہو کے پوچھا ''کیا جلدی بتاؤ''۔

وہ ڈرامے کرنے لگا کہ ''چھوڑو بھی کچھ خاص نہیں ہے''۔

میں دل برداشتہ ہو رہا تھا ''جلدی بتاؤ ورنہ دونگا ایک رکھ کے''۔

وہ ایسے بتانے والا نہیں تھا ''اچھا اب اُس کے لیے مجھے بھی مارے گا''۔

اُس کے بازوں کو مروڑتے ہوئے کہا ''زیادہ نخرے کریگا بتانے میں تو خوب پٹائی کرونگا''۔

وہ ہنستے ہوئے بولا ''ارے غصہ ہوتے ہو بتاتا ہوں یار سانس تو لینے دو''۔

میں نے اُس سے بات جلد نکلوانی تھی ''نہ نہ سانس بعد میں لینا پہلے مجھے بات بتاؤ''۔

''بتاتا ہوں''۔یہ کہ کر وہ بھاگا اور میں اُس کے پیچھے دوڑا۔اُس کا گلہ ہاتھ میں آیا تو کہا ''بتاتا ہے یا ماردوں''۔

وہ کراہتے ہوئے بولا ''ماردے، مجھے مارے گا تو بات کون بتائے گا''۔

تب میں نے جلدی سے چھوڑ دیا تو اُس نے کہا ''یہ ہوئی نہ بات اب ادب سے کھڑے ہو جاؤ اور کہو کہ پلیز بتا دو''۔

میں ہنستے ہوئے بولا ''کُتا نہ بن بتا بھی دو''۔

وہ کہنے لگا ''اُس نے کہا کہ۔۔۔۔ تم کیوں بس چھوڑ کے چلے گئے کسی سے خفہ ہو گیا؟''

یہ سننا تھا کہ جیسے میرے منہ سے ہنسی چھین گئی ہو۔

جلال نے پریشان چہرہ دیکھا تو کہا کہ ''تم خوش نہیں ہوئے؟''

میں آنکھوں میں آنسو لیا بولا ''پتہ نہیں یار کہ مجھے خوش ہونا چاہئے یا خفہ؟''۔

وہ آہ بھر کے بولا ''تمہاری مجھے سمجھ نہیں آئی۔اب جبکہ خوشی کا موقع ہے تو تم منہ پُھلائے ہوئے ہو''۔

میں نے کہا ''جب اُس نے مجھے ٹُھکرا دیا تو پھر میرے بارے میں پوچھنے کی وجہ؟''۔

اُس نے جواب میں کہا ''وہ تم اُس سے خود پوچھ لینا۔کل چھٹی میں اُس سے مل لینا''۔

مگر میں نے انکار کیا ''مجھے نہ اُس سے ملنا ہے نہ اُس کے سامنے جانا ہے''۔

وہ مجھ پہ ہنستے ہوئے بولا ''ڈرتے ہو کیا''۔

میں غیرت میں آ گیا ''میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا۔اور ابھی کیوں نہ ملوں''۔

یہ کہ کر میں وہاں سے چلا گیا۔جب جا رہا تھا تو ثانیہ نظر آنے لگی میرے قدم آگے جانے کے لیے نہیں بڑھ رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا کہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہو اور کہ رہی ہو کہ مت جاؤ ایسا نہ ہو کہ اُسے بُرا لگے۔مگر مجھے پتہ کرنا تھا کہ اُس نے آخر میرا کیوں پوچھا؟ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مجھے پسند کرتی ہے تو میرے گفٹ مجھے واپس کیوں دیں۔اور اگر میرے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا تو کس وجہ سے؟

''وہی تو میں جاننے آیا ہوں''۔اپنے آپ سے کہتے ہوئے میں بڑھنے لگا۔

میرے پاؤں کی چاہت کے خلاف میں نے آگے قدم اُٹھائے۔وہاں اور بھی لڑکیاں تھی۔میں نے سوچا اگر میں اشارہ کرونگا تو ٹھیک نہیں ہوگا اس لیے میں گیا اور اُسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کیا۔

وہ چونکتے ہوئے ''یہ کیا ہے؟ سب دیکھ رہے ہیں''۔

لڑکیاں دیکھ رہی تھیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ملاتے ہوئے کہا ''وہی تو میں پوچھنے آیا ہوں کہ یہ کیا ہے۔میرا تماشا کیوں بنا دیا ہے؟''

اُس نے انجان بنتے ہوئے کہا ''کیا مطلب کیا ہوا ہے؟''

آنکھیں نکالتے ہوئے کہا ''مطلب میں پوری بات پھر سے دہراؤ''۔

وہ معصومیت سے بولی ''ہاں! بتاؤ گے نہیں تو پتہ کیسے چلے گا''۔

میں نے کہا ''تم نے جلال سے کیا کہا تھا؟''

وہ مجھے سے کہلوانا چاہتی تھی ''اُس سے ہر وقت بات ہوتی ہے تم کونسی بات کا کہ رہے ہو اور ویسے بھی اگر اُس نے کہ دیا تو پھر کیا لینے آئے ہو؟''۔

آخر میں نے کہ دیا ''تم نے ایسا کیوں کہا کہ میں بس چھوڑ کر کیوں گیا؟''۔

وہ مسکرائی اور کہا ''اُف جلال بھی نہ اُس نے یہ بات تمہیں بتا دی۔ہاں میں نے یہ کہا تھا مگر اس میں اتنی پریشانی والی کونسی بات تھی۔تم اتنے دن نہیں تھے تو میں نے پوچھ لیا''۔

کاش اپنے پاؤں کی مان لیتا تو یہ سننا نہ پڑتا اور یہ خوش فہمی تو ہوتی کہ مجھے پیار کرتی ہے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ''اوے! اس خوشی میں مت رہنا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں''۔

مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اس لیے میں مڑ کر واپس آنے لگا۔

ثانیہ کہتی رہی ''اور ہاں آئندہ ایسی حرکت کرنے کی جُرات مت کرنا''۔

میں جانے لگا اور کچھ سوچ کر پلٹا۔

ثانیہ مجھے مڑتے ہوئے دیکھ کر بولی ''جی کچھ اور؟''۔

مجھے اُسے اس بات کا جواب دینا تھا ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور جو اُداس رہتا ہوں وہ بھی تیرے لیے''۔

وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''جی! بالکل''۔

میں مسکراتے ہوئے کہا ''غلط سوچتی ہو۔ چپ اس لیے ہوتا تھا کہ کسی سے دور تھا وہ دوسرے بس میں تھی اس لیے میں گاڑی بدل کر وہاں گیا''۔

اُس کے چہرے پہ پریشانی دکھائی دی ''وہ۔۔۔کون؟''۔

میں سمجھ گیا اور کہا ''اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ میں اب وہاں پہ بہت خوش ہوں''۔

''وہ۔۔۔۔۔۔''۔ میری بات سن کر وہ کچھ غمزدہ سی ہوئی اور کچھ کہہ نہ پائی۔

میں نے اُس کے ہر بات کا جواب اُس کے زبان میں دینا تھا اس لیے کہا کہ ''اور ہاں ائندہ میرے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کیسا ہوں، کہاں ہوں، تمہیں جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں''۔

اُس کے رو دینے والی شکل سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں نے تیر نشانے پہ مارا ہے۔ مگر خیرانی اس بات پہ ہو رہی تھی کہ یہ کہانی میرے ذہن میں آئی کیسے۔ میں اپنے جوابات پہ خوش ہوا مگر اُس کی اُداسی سے مجھے بھی دکھ ہوا۔ اُس کی اُداسی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ مجھے پیار کرتی ہے مگر اُس نے اتنے نخرے کیوں کئے؟ اب اُس پل کا انتظار تھا کہ کب وہ خود کہی گی کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔

میں اب بھی دوسرے بس میں تھا مگر میں ثانیہ کے سامنے آتا رہتا تھا اور وہ مجھے دیکھتے ہی آنکھیں نیچے کر لیتی تھی۔ ایک دن بس کی ایک لڑکی ''جویریہ'' جو کہ میری ہم جماعت تھی مجھے دی ہوئی کاپی کا پوچھ رہی تھی اور اتفاق سے ثانیہ بھی وہاں نزدیک ہی تھی۔ وہ ہمیں بات کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر سن نہیں سکتی تھی۔

میں نے ہنستے ہوئے اُسے کہا کہ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ اُس کاپی پہ مجھ سے چائے گر گئی ہے اور پوری خراب ہوگئی ہے''۔

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ''اگر میری کاپی کا ایک بھی صفحہ خراب ہوا ہو تو میں تمہاری جان لے لونگی''۔

میں اس بات پہ ہنسنے لگا اور یہ ثانیہ کو بُرا لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں پسند کرتا ہوں۔

جویریہ جانے لگی ''اچھا میں چلتی ہوں ثانیہ گھور رہی ہے''۔

میں حیران ہوا کہ ''کیا تم اُسے جانتے ہو؟''

اُس نے کہا ''ہاں! وہ میری سب سے اچھی دوست ہے''۔

میں نے پوچھا ''تو گھور کیوں رہی ہے؟''

اُس نے دھیمی آواز میں کہا ''ارے ڈفر تم سے پیار جو کرتی ہے۔ کسی لڑکی کو تیرے ساتھ دیکھی گی تو غصہ تو ہوگی اور میری تو جان لے لی گی''۔

دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے ''تمہیں کس نے کہا''۔

وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی ''یہ لو! سارا دن میرا دماغ کھاتی رہتی ہے۔ بس تم اور تمہاری باتیں''۔

ثانیہ کو دیکھتے ہوئے جویریہ نے جاتے ہوئے کہا ''لگتا ہے وہ یہیں آ رہی ہے میں چلی''۔

وہ جانے لگی اور میں نے ثانیہ کو سنانے کے لیے اُسے آواز دی ''ٹھیک ہے جی! کل ملتے ہیں''۔

اب تک ثانیہ مجھے نظرانداز کرتی تھی آج میں کر رہا تھا۔ جب وہ قریب آئی تو میں وہاں سے جانے لگا۔

ثانیہ مجھے کہنے لگی ''اتنی بُری لگنے لگی ہوں''۔

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا ''جی؟ مجھ سے کچھ کہا؟''

وہ کہنے لگی ''جویریہ ہی وہی لڑکی ہے نہ جسے تم پسند کرتے ہو۔ وہ تو میری اچھی دوست ہے لیکن اُس نے مجھے کبھی ایسا نہیں کہا''۔

میں نے جواب دیا ''شاید؟ مگر وہ کہتی ہے کہ ثانیہ تم سے پیار کرتی ہے اور میں اُس کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔ کیا تم سچ میں مجھ سے پیار کرتی ہو؟''۔

وہ سر جھکائے چپ کھڑی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اب کہنا چاہیئے۔

میں نے کہا ''تم جو سوچ رہی ہو ویسا کچھ نہیں ہیں۔ میں تو پہلے اظہار کر چکا ہوں کہ صرف تم سے پیار کرتا ہوں اور کرتا رہونگا''۔

وہ مجھے دیکھ کر بولی ''تو پھر وہ سب۔۔۔۔''۔

میں نے اُسے مسکراہٹ میں جواب دیا ''وہ ایک دکھاوا تھا تمہیں اس پہ مجبور کرنے کے لیے کہ تم میرے پاس آ ؤ''۔

اُس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک آئی اور مجھ سے کچھ کہے بنا لپٹ پڑی۔ کیا بتاؤں کیسا لگا مجھے کسی زبان میں وہ الفاظ نہیں ملے جس میں اُسے بیان کروں۔ جتنے بھی غم، دکھ، درد ملے تھے اُس پیار میں وہ ایک ہی پل میں بہہ گئے۔ میرے زخم بھر گئے، آنسوں خشک ہوگئے، سسکیاں بند ہوگئی، اُداسی ختم ہوگئی۔ میں نے اُسے باہوں میں لے لیا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں نے اپنے باہوں میں ساری دنیا سمیٹ لی تھی۔ جلال یہ منظر دیکھ کر مسکرایا اور منہ دوسری طرف کر دیا۔ وہ خوش تھا کہ ثانیہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا ورنہ کافی چرچہ ہو جاتا۔ نہ چاہتے ہوئے میں نے اُسے اپنے تن سے جُدا کیا۔ میں اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھ رہا تھا۔

جلال ثانیہ سے ''چلو! بس آگئی (اور مجھ سے کہنے لگا) اچھا کل ملتے ہیں''۔

میں نے کہا ''اب کیوں نہیں؟ گاؤں تک تو ساتھ جا رہے ہیں نہ''۔

جلال کو میری بات سمجھ نہیں آئی ''مطلب؟''۔

میں نے کہا ''بتاتا ہوں''۔

یہ کہہ کر میں بھاگا اور جویریہ کے پاس گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''آج میں تیری وجہ سے بہت خوش ہوں۔ یہ مجھ پہ اُدھار ہا کبھی بھی کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔ شکریہ بہت بہت''۔

وہ سمجھ گئی اور مسکرا کر ہاں کہنے کے لیے سر ہلایا۔ میں ڈرائیور کے پاس گیا اور اُسے کہا ''آج تک کے پیسے آپ کو مل جائنگے کیونکہ میں واپس اپنی بس میں جا رہا ہوں''۔

یہ کہنا تھا کہ بھاگتے ہوئے اپنے پرانے دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔

جلال بہت خوش ہوا اور کہا ''او! اب سمجھ میں آیا (گلے لگتے ہوئے) یہ ہوئی نہ بات''۔

سب دوستوں سے ملا اور میرے واپس آنے کا جشن منایا۔ آج ثانیہ بھی خوش تھی اور بار بار دیکھ رہی تھی۔ مگر میری خوشی کی تو انتہا نہ تھی۔ میری طبیعت کی بحالی گھر والوں کو بھی محسوس ہوئی۔ مسئلہ تھا کہ یہ خوشی میں کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا۔ بس اپنے کمرے میں خوشی کے گیت گاتے ہوئے ناچتا رہا۔ میں نے ایک خط لکھا اور اُس میں وہ سب کچھ لکھ ڈالا اور وہی سوال کہ اگر وہ مجھ سے پیار کرتی تھی تو مجھے اتنا ستایا کیوں؟ صبح جلال کو خط ملا اور اُس نے ثانیہ کو دے دیا۔

اگلے روز جواب ملا اپنے حالات اور اظہارِ محبت کے بعد اُس نے اُس سوال کا جواب دیا کہ ''شروع میں تو تم عجیب لگے ہر وقت ہنسی مزاق اور مستی مگر پھر اُس کی عادت ہوگئی اور کچھ ہی وقت میں تم مجھے اچھے لگنے لگے۔ جب تمہاری نظریں مجھ پہ پڑتی تھیں میں اُن میں اپنے لیے پیار پاتی تھی۔ ایک دن تم نے خط اور تحفہ دیا۔ میں اتنی خوش تھی کہ پھولے نہ سمائی۔ مگر آج کل کے واقعات کو دیکھتے ہوئے کہ لڑکا صرف لڑکی سے ٹائم پاس کرتا ہے اور مجھے ایسا کچھ نہیں کرنا تھا اس لیے میں تمہیں آزمانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہارا وہ تحفہ قبول نہیں کیا۔ پھر جب تم بہت اُداس رہتے تھے مجھے احساس ہوا کہ تم ویسے نہیں ہو اس لیے میں تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں ہوئی۔ تم نے بس چھوڑی اور میں نے جلال سے وجہ پوچھی تم میرے پاس آئے۔ تب تم اتنے اچانک آئے اور لڑکیاں دیکھ رہی تھی اس لیے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا اور بتانے کی ہمت نہ ہوئی پھر مجھے لگا کہ ایسا نہ ہو میرے نہ کہنے کی وجہ سے تم مجھ سے دور ہوتے جاؤ اور اُس دوسری لڑکی کے اور پاس۔ تب مجھے ہمت کرنی پڑی۔ اب مجھے یقین ہے کہ تم کبھی مجھے نہیں چھوڑو گے۔ میں صرف تمہارا ہونا چاہتی ہوں، تمہارے باہوں میں سونا چاہتی ہوں اور صرف تم سے پیار کرنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہیں کھو دوں''۔

ثانیہ کا یہ مجھ پہ بڑا احسان تھا کہ اُس نے میرے محبت کا جواب محبت سے دیا۔ ہر روز بس میں اُس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتا تھا۔

ایک دن جلال کہنے لگا ''جب سے ثانیہ سے تمہاری صلح ہوئی ہے تب سے تم مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔ لگتا ہے مجھے بھول گئے ہو، بہت مطلبی انسان نکلے یار''۔

میں اُس کی بات پہ ہنستے ہوئے بولا ''خود کو بھول سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں۔ بہت انسو بہانے کے بعد ملی ہے اس لیے کچھ دن میں صرف اُس کا ہونا چاہتا تھا''۔

وہ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ''مگر میری کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے میں پل بھر کے لیے بھی اس دوستی کو نہیں بھلا سکتا''۔

اُس کے ان الفاظ نے میرے آنکھوں میں آنسو لے آئے اور میں اُس کے گلے لگ گیا۔ وہ مجھ سے کئی گنا اچھا تھا، دوستی کو فرض سے زیادہ ترجیح دے رہا تھا۔

میں نے کہا ''میں بہت خوش قسمت ہوں، ایک طرف سب سے اچھا دوست اور دوسری طرف میرا پیار۔ اگر مجھے زندگی میں اور کچھ بھی نہ ملے تب بھی اس کا شکر ادا نہیں کر پاؤ نگا''۔

وہ کہنے لگا ''تم اچھے انسان ہو اور اچھے لوگوں کے ساتھ اچھا ہوتا ہے''۔

یہ سن کر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے ثانیہ کو دیکھا وہ چپ چپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی اور شاید ہنس بھی رہی تھی۔

ایک دو ہفتوں میں سالانہ امتحان شروع ہونے والا تھا۔ جتنا ہو سکا پڑھا اور پاس کر کے ایک جماعت آگے چلا گیا۔ اگلے سال کی شروعات کچھ اچھی نہیں ہوئی۔ میں خوش تھا، وہ خوش تھی، جلال خوش تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خوش ہے۔ ثانیہ کی انکھوں میں ایسا نشہ تھا کہ اُسے دیکھتے ہی چڑ جاتا تھا۔ اُس کی ہنسی ایسی دلفریب تھی کہ کوئی اور آواز سننے کو دل نہیں کرتا تھا۔ جب بھی میں اُسے دیکھتا تھا وہ آنکھ مارتی تھی اور بس دل کرتا کہ موت کا فرشتہ آئے اور یہیں پہ جان دے دوں۔ اُسے پتہ تھا کہ میں ان حرکتوں کی وجہ سے درد میں ہوں مگر وہ مجھے تڑپانے کے لیے بار بار کرتی تھی۔ مجھے اُس کے اس وار کا جواب دینا تھا اُس کے بعد جب اُس نے آنکھ ماری تو میں نے ہونٹوں کو گول کر کے ایسے ظاہر کیا کہ جیسے میں اُسے چھوم رہا ہوں تو اُس نے اپنی انکھیں نیچے کر دیں۔

جلال نے یہ دیکھ کر کہا ''تم لوگوں میں شرم ہے کہ نہیں''۔

لیکن میں نے کہا ''اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تم چاہو تو میں تم سے بھی ایک کِس لوں''۔

میں نے اپنے ہونٹ اُس کے گال کے قریب لائے اُس نے تھپڑ ماری اور کہا ''اوے اوے! یہ کیا کر رہے ہو کسی نے دیکھا تو؟''

میں نے کہا ''کہیں گے کہ دو گہرے دوست ہیں ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں''۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' وہ یہ کہ کر بھاگ گیا اور میں ہنستے ہنستے سیٹ سے گر گیا۔

دو تین بار ثانیہ کو ایسے اشارے کرنے کے بعد وہ اپنی حرکت سے باز آ گئی۔ ہم اپنی دنیا میں مست تھے مگر ہمارے درمیان جو چل رہا تھا اس پہ کسی اور کی بھی نظر تھی۔

یہ سب حرکتیں ایک لڑکا اسد نام کا نوٹ کر رہا تھا۔ ہمیں گلے لگتے ہوئے بھی اُس نے دیکھا تھا لیکن مجھے تب پتہ نہیں تھا۔ یہ لڑکا جویریہ کے ساتھ بس میں ہوتا تھا اور ہمارے بارے میں اُس کو کافی کچھ پتہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی میرے اور ثانیہ کے بارے میں اُسے سب کچھ بتا رہا ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا جب کہ میرے پاس دوست بیٹھے ہوئے تھے اور مجھ سے کہنے لگا ''مجھے ۱۰۰ روپے چاہئے''۔

میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا ''تو میں کیا کروں مجھ سے کیوں مانگ رہے ہو۔ تیرا باپ ہوں کیا؟''

وہ جواب میں بولا ''کیونکہ اگر تم نہیں دو گے تو میں تمہارا ایک راز فاش کر دونگا''۔

میرا کوئی اور راز نہیں تھا اس لیے مجھے شک ہوا کہ یہ ثانیہ والی بات ہے اس لیے مجھے پریشانی ہوئی کہ اس کو کیسے پتہ چلا۔ میں نے اُسے لے جا کر ایک طرف کر دیا جہاں کوئی نہیں تھا تا کہ کہیں اُس کے منہ سے سب کے سامنے کچھ نکل نہ جائے۔

میں نے غصہ میں کہا ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو ایسی کونسی بات تمہیں میرے بارے میں پتہ ہے''۔

وہ آہستہ سے بولا ''تم اور ثانیہ''۔

میری انکھیں نکل آئیں کہ میرا شک صحیح نکلا۔

اُس نے یہ بھی کہا ''جب تم اُس سے گلے ملے تھے''۔

میں حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔

وہ اور بولتا گیا ''اور بہت کچھ پتہ ہے فل حال ١٠٠ روپے دو تا کہ میرا منہ کچھ وقت کے لیے بند رہے باقی کا بعد میں دیکھیں گے''۔

میں ڈر گیا تھا اس لیے میں نے جلدی ١٠٠ روپے اُسے دے دیئے اور کہا ''اگر کسی کو پتہ چل گیا تو اپنی قبر خود کھودنا''۔

اُس نے کہا ''فکر نہ کرو جب تک یہ ١٠٠ روپے ختم نہیں ہوتے تب تک تو کبھی نہیں''۔

یہ کہ کر وہ چلا گیا۔ جب دوستوں کے پاس آیا تو وہ پوچھ رہے تھے کہ ایسا کیا ہے جو ہمیں نہیں پتہ اور اُسے پتہ ہے۔

میں نے بات مزاق میں ٹالتے ہوئے کہا ''کچھ نہیں یار اُسے غلط فہمی ہوئی تھی''۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں یہ روز بہ روز زیادہ سے زیادہ پیسے مانگے گا اور تنگ کرے گا۔ اُس دن چھٹی پہ بس میں بھی پریشانی کے اثرات چہرے پہ نمایاں تھے۔ کیونکہ مجھے اپنی پرواہ نہیں تھی بلکہ ثانیہ کی عزت کا خیال تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور شاید میری پریشانی کو دیکھ لیا تھا اور انکھوں ہی انکھوں میں پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا مگر کیا کہتا اور کیسے۔

مجھ سے بڑے بھائی ہیں، شہزاد، جو کہ دماغ سے تھوڑے تیز ہے مگر میرے ساتھ اچھے دوست کی طرح ہے۔ میں نے اُس کو بتانے کا فیصلہ کیا مگر سوچا کہ اگر اُس نے گھر میں ثانیہ والی بات کر دی تو اُس سے بھی بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ مجھے جب اور کوئی علاج دکھائی نہ دیا تو آنکھیں بند کر کے اُسے بتا دیا۔ وہ غصہ ہوا کہ میں نے اُسے پیسے کیوں دیے۔ کیوں نہ اُسے ایک دو لگائی۔

پھر اُس نے کہا ''مجھے اُس سے ملواؤ''۔

میں نے چھٹی کا وقت بتایا کہ اُس وقت آ جاؤ۔ اسد غریب گھرانے سے تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ پلٹ کے وار نہیں کر سکتا اس لیے اُس کو صرف ڈرانا کافی ہوگا۔ لیکن شہزاد کا پتہ نہیں کہ وہ کیا کرے گا۔ مجھے اور اُسے پتہ نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ پتہ نہیں شہزاد کیا کرنے کے سوچ سے ائے گا۔ جب چھٹی ہوئی شہزاد دو اور لڑکوں کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ شہزاد اور ایک لڑکے کے پاس پستول تھی اور ایک کے پاس بندوق۔

اپنے آپ سے کہنے لگا ''او! یہ لوگ تو پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں''۔

میں شہزاد سے ملا اور کہا ''یہ کیا ہے صرف ڈرانا ہے اسلحہ کی کیا ضرورت تھی''۔

شہزاد نے کہا ''وہ تم ہم پہ چھوڑ دو''۔

ان میں سے ایک لڑکے نے کہا ''تم نہیں جانتے ایسے لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے''۔

شہزاد نے دانت بجاتے ہوئے کہا ''تم ہمیں وہ لڑکا دکھاؤ اور پھر اپنی گاڑی میں جا کے بیٹھو باقی ہم سنبھال لینگے''۔

میں نے کہا ''زیادہ کچھ کہنا مت''۔

وہ غصہ ہوتے ہوئے بولا ''میں نے کہا نہ کہ وہ ہم پہ چھوڑ دو بس تم لڑکا دکھا کہ کے چلے جاؤ''۔

میں ادھر اُدھر نظر دوڑانے لگا اور نظر اُس پہ جا کے رک گئی۔ وہ اور جویریہ ساتھ آ رہے تھے۔ تب مجھے سمجھ آیا کہ اُسے میرے بارے میں کون بتاتا ہے۔ میں نے شہزاد کو اشارے سے بتایا کہ وہ آ رہا ہے۔ شہزاد نے مجھے جانے کے لیے کہا اور اُن دو لڑکوں کو لے کر اُس کی طرف جانے لگے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے جانے لگا شہزاد نے اسد کو بازوں سے پکڑا اور ایک طرف لے جانے لگا۔ وہ بچارہ تین بندوں کو اسلحہ کے ساتھ دیکھ کر ڈر گیا اور سہمے سہمے آواز میں کہ رہا تھا۔

وہ ڈرتے ہوئے بولا ''تم لوگ کون ہو اور مجھے کیوں اور کہاں لے کے جا رہے ہو؟''

سارے لڑکے اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔ جویریہ ڈر کے مارے کچھ نہ بول پائی، رونے لگی اور وہاں لاچار کھڑی رہی۔

جب اُس نے مجھے دیکھا تو کہا کہ ''دیکھو نہ میرے بھائی کو کہاں لے کے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ کون ہیں؟''

میں نے حیرانگی سے کہا ''اسد تمہارا بھائی ہے؟''

وہ روتے ہوئے بولی ''ہاں! اُسے چھڑاؤ نہ''۔

میں نے سخت لہجہ میں کہا ''اگر تم نے اُسے میرے اور ثانیہ کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو یہ دیکھنا نہ پڑتا''۔

وہ سمجھ گئی کہ یہ لوگ میرے ساتھ ہیں۔ وہاں شہزاد اُس سے پوچھ رہا تھا کہ اُس نے مجھے کیوں دھمکی دی۔

جویریہ نے اُسے بچانے کے لیے مجھے ہاتھ پکڑ کر کہا ''اُسے پہلے سے پتہ تھا۔ میں نے تو ایک دو باتیں بتائی ہیں۔ جب اُس نے مجھے ۱۰۰ روپے والی بات بتائی تو میں نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا اور اُس نے کہا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا''۔

لیکن میں نے اس کی ایک نہ مانی ''آج جب دو چار پڑینگے تو پھر کبھی بھی کسی کے ساتھ ایسا نہیں کرے گا''۔

جویریہ میرے پاؤں پکڑنے پہ آ گئی ''تمہیں خدا کا واسطہ اُسے روکو''۔

تب تک شہزاد نے اُسے مارنا شروع کیا تھا۔

میں نے اُسے اُٹھایا اور کہا ''میں اُنہیں اب نہیں روک سکتا۔ اسد کو پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ وہ کس سے پنگا لے رہا ہے''۔

شہزاد اور وہ لڑکے اسد کی پٹائی کرتے رہے۔

جویریہ روتے ہوئے بولی ''تم۔۔۔تم روک سکتے ہو اُنہیں کہو۔۔۔کہو کہ اُسے نہ مارے''۔

اُسے وہ میرا کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور کہا ''تمہیں تو یاد ہو گا تم نے کہا تھا کہ مجھ سے کبھی بھی کچھ بھی مانگ سکتے ہو تو اُس وعدے کے مطابق تمہیں میری بات ماننی پڑے گی''۔

میں اپنے کئے ہوئے وعدے کے سامنے بے بس ہو گیا اور میں نے جا کر اسد کو شہزاد سے چھڑا دیا۔

شہزاد بہت غصہ تھا اور اُسے چھوڑنے والا نہیں تھا ''اُس سے کہو کہ اگر ویسے بھی تمہارے پاس آیا تو اچھا نہیں ہو گا''۔

میں نے اُن لڑکوں سے کہا کہ شہزاد کو لے جاؤ۔

اور اسد سے کہا کہ ''شکر کرو جویریہ تیری بہن ہے ورنہ آج خود چل کے نہ جاتے''۔

''کیا تماشا لگایا ہوا ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو''۔ میں نے کھڑے تماشا کرتے ہوئے لڑکوں سے کہا۔

اسد ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ''مجھ سے غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے ایسا کیا تھا اور وہ ۱۰۰ روپے خرچ ہو گئے''۔

میں نے کہا ''اُس کو گولی ماروں مگر آئندہ کچھ اُلٹا سیدھا کیا تو جویریہ کے کہنے پہ بھی نہیں چھوڑونگا''۔

یہ کہہ کر میں جانے لگا تو اُدھر کسی نے پرنسپل تک بات پہنچائی وہ تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔ میں پلٹ کے جانے لگا تو مجھے آواز دی کہ ''رکو''۔

مجھ سے پوچھنے لگے ''کیا ہو رہا تھا یہاں وہ لوگ کون تھے جو لڑ رہے تھے؟''

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا ''میں تو یہاں نہیں تھا۔ مجھے کیا پتہ''۔

پرنسپل نے اسد سے پوچھا ''تم بتاؤ کس نے مارا؟ کون تھے وہ لوگ؟''

اسد نے مجھے دیکھا اور کہا ''میں اُنہیں نہیں جانتا''۔

پرنسپل سوال پہ سوال پوچھتا گیا ''کیا وہ اس سکول کے تھے؟''

اسد نے کہا ''نہیں سر۔ پتہ نہیں کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ میں کسی کو نہیں جانتا تھا''۔

وہ اُس پہ غصہ نکالتے ہوئے بولے ''آئندہ یہاں لڑائی کی تو تمہیں اس سکول سے نکال دونگا''۔

وہ چلتا بنا اور میں نے بھی بس کی طرف قدم بڑھائے۔ مجھے اسد پہ ترس آیا مگر یہ خود اُس نے کروایا تھا۔

جلال جو کہ اس رنگین دنیا میں ایک سادہ بندہ تھا جس کو نہ کسی اور کے کام سے کام نہ دنیا کی خبر۔ اُس کو اِس بات کا بھی پتہ نہیں چلا۔

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ''کیا ہوا وہاں؟ کسی کی لڑائی ہوئی کیا؟''

میں نے خیرت سے پوچھا ''تم وہاں نہیں تھے؟''

وہ کہنے لگا ''تمھیں تو پتہ ہے کہ مجھے ایسے چیزوں سے ڈر لگتا ہے''۔

ثانیہ بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے مطمئن کر دیا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگلے دن جلال نے خط دی جس میں کئی سوال کیئے تھے۔''اس دن کیا ہوا تھا، اسد نے ایسا کیا کیا تھا کہ تم پریشان تھے اور پھر اس کے ساتھ لڑائی کیوں کی''۔ میں اُسے سارا واقعہ لکھ ڈالا۔ وہ ڈر گئی کہ ایسا نہ ہو کہ''وہ میرے گھر والوں سے کہ دے''۔

میں نے اطمنان دلایا کہ''اُس کو اپنا سبق مل گیا ہے وہ اب ایسا نہیں کریگا''۔

''مجھے تم پہ بروسہ ہے''۔

''کب تک رہے گا''۔ ''جب تک سانس ہے''۔

''ساتھ کب تک دوگی''۔ ''جب تک دل کی دھڑکن ہے''۔

''پیار کب تک کروگی''۔ ''جب تک رگوں میں خون ہے''۔

''اور کتنا تڑپاؤ گی''۔ ''جب تک زندگی ہے''۔

''اگر میں مر گیا تو''۔ ''چپ ایسا نہیں کہتے۔تڑپاؤنگی تو میں نہ اس لیے میری موت تم سے پہلے ہوگی''۔

(مجھے زندگی بھر اسی بات کا افسوس رہے گا کہ میں نے ایسی بات کیوں کی کہ اُسے ایسا کہنا پڑا)

اگلے دن جلال میرے پاس آیا اور کہا ''مجھے تنخواہ چاہئے''۔

میں نے اُس پہ آنکھیں نکالتے ہوئے کہا ''کمینے اب مجھ سے پیسے مانگے گا''۔

اُس نے کہا ''تو ٹھیک ہے میں کوئی خط نہ اُسے دونگا نہ اُس سے لونگا''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''منظور ہے ویسے بھی میں نے کچھ اور سوچا ہے۔ میں موبائل خرید رہا ہوں۔ ہم اُس سے بات کرینگے تب تمہاری ضرورت نہیں ہے''۔

وہ روٹھنے کا ناٹک کرنے لگا ''مطلب میں ببل کی طرح تھا جب تک مٹھاس تھی چبا رہا تھا اور جب مٹھاس ختم ہوگئی تو ابھی پھینکنے کا اِرادہ ہے''۔

میں نے اُسے دونوں ہاتھوں میں جھکڑ کر کہا ''تم تو میری جان ہو۔ یار تمھیں کیا پتہ ثانیہ اور تو میرے زندگی کے انمول تحفے ہو''۔

اُس نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ''تم بڑے چالو چیز ہو ایموشنل بلیک میل کرتے ہو''۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تم تو بڑے سمجھدار بن گئے ہو یار''۔ وہ بھی اس بات پہ ہنس پڑا۔

میں اور ثانیہ نے موبائل خرید لئے۔ ثانیہ کا موبائل جلال کے پاس ہوتا تھا جب مجھے اُس سے بات کرنی ہوتی تو جلال اُسے دے دیتا تھا۔ اس لیے کہ اگر کوئی ثانیہ کے پاس دیکھ بھی لے تو وہ کہی گی کہ جلال کا ہے اور میرے دوست نے کال کی تھی۔ جلال اب بھی ہمارے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں مگر کبھی ملے نہیں تھے۔ مجھے اُس سے ملنی کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے یہ خواہش اُسے ظاہر کر دی۔

اُس نے کہا کہ ''ہمارے ایک رشتہ دار کی شادی ہے اُس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کہاں اور کب ملنا ہے''۔

باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ ہمارے رشتے میں بھی آتے ہیں اور اُس شادی میں ہمیں بھی دعوت تھی۔ اتفاق اس پہ ہوا کہ ہم وہاں ملیں گے۔

ثانیہ نے کہا ''اگر تم گھر کے اندر آسکتے ہو تو ہم وہاں کچھ منٹ کے لیے مل سکتے ہیں''۔

میں بولا کہ ''میں تو آجاؤنگا مگر ہم ملیں گے کہاں؟ اور اگر ہم پکڑے گئے تو؟''

ثانیہ نے اطمنان دلاتے ہوئے کہا ''تم اُس کی فکر مت کرو۔ اُن میں میری ایک اچھی دوست ہے ہم اُس کے کمرے میں ملیں گے''۔

میں راضی ہوا اور کہا کہ ''تم موبائل لے کر جانا ہم اُسی دن رابطہ کرینگے''۔

وہ کہنے لگی ''میں اُس دن تمہارا انتظار کرونگی''۔

مجھے بہت ڈر لگنے لگا تھا کہ اگر خدانخواستہ ہم پکڑے گئے تو کیا ہوگا۔ میں اُن کچھ دنوں میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس وقت اور کیسے ملا جائے۔ جب میں وہاں جاؤنگا پہلے اُن لڑکوں

کے ساتھ دوستی بناؤنگا جو کام کر رہے ہوں۔ پھر اُن کے ساتھ اُن کے کام میں ہاتھ بٹاؤنگا۔ اور جب گھر میں کھانا لگانے کی باری آئے گی تو میں اُن کے ساتھ اندر جاؤنگا۔ تب میں ثانیہ کو فون پہ بتاؤنگا کہ اب وہ اُس کمرے میں چلی جائے میں لڑکوں کی نظروں سے پناہ ہو کر آتا ہوں۔ وہ مجھے کمرہ دکھا کر اندر جائیگی اور میں اپنے آپ کو لوگوں میں گھما دونگا اور چُپ کے اُس کمرے تک پہنچوں گا۔ مل کے واپس نکلنے کے لیے مجھے اُس کے دوست کی ضرورت تھی۔ جب ہم ملے تو کچھ وقت کے بعد وہ آئے اور دروازہ کھٹ کھٹا کر مجھے باہر بُلا لے۔

اُسی دن سب کچھ میرے پلین کے مُطابق ہوا۔ ویسا ہی ہوا جیسے سوچا تھا۔ میں کمرے میں پہنچ گیا، ثانیہ وہاں آئی ہوئی تھی۔ اُس نے کنڈی لگالی کہ کوئی آ نہ جائے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو کچھ وقت کے لیے کھڑے دیکھتے رہے اور پھر ویسے ہی لپٹ پڑی جیسے پہلے لپٹی تھی۔ مجھ سے بھی رہا نہیں گیا اور میں نے بھی اُسے باہوں میں بھر لیا۔

میں مدہوش تھا کہنے لگا کہ ''مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تم میرے باہوں میں ایک بار پھر آ گئی ہو''۔

ثانیہ خوشی سے کہنے لگی ''مجھے بھی، یہ دوسری دفعہ ہے کہ میں تم سے گلے مل رہی ہوں اور انہی دو دفعہ میں مجھے جتنا سکون ملا ہے وہ پوری زندگی نہ ملا ہے اور شاید نہ ملے گا''۔

ایک دوسرے کے باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے ہم کچھ دیر ایسے کھڑے رہے اور ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے ایک دوسرے کے تن سے جُدا ہوئے۔ میں نے اُسے بٹھایا اور اُس کے قدموں میں بیٹھ کر اُسے دیکھتا رہا۔

وہ شرماتی ہوئی بولی ''کیوں ایسے دیکھ رہے ہو پہلی بار دیکھ رہے ہو کیا؟ اور میرے قدموں میں کیوں بیٹھے ہو میرے ساتھ بیٹھو''۔

میں کچھ نہ بولا بس اُسے دیکھتا چلا گیا۔

اُس نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''ایسے نہ دیکھو جی مجھے شرم آتی ہے''۔

میں نے اُس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ''جی بھر کے دیکھنے دو مجھے''۔

وہ بڑے پیار سے بولی ''صرف دیکھتے رہو گے یا کچھ بولو گے بھی؟ (دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں پہ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی) کتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟''

میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''خود سے پوچھوں، جتنا تم کرتی ہو''۔

اُس نے پوچھا ''کیا ثبوت ہے اس بات کی کہ تم مجھ سے بے حد پیار کرتے ہو۔ کیونکہ میں تو ایسا کرتی ہو''۔

میں نے جواب دیا ''پیار کو ثبوتوں کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر بھی وقت آنے پہ پتہ چل جائے گا''۔

کہنے لگی ''کیا میرے بنا جی پاؤ گے؟''

میں نے کہا ''موت تو خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن اگر زندہ رہا تو وہ زندگی موت سے بدتر ہوگی۔ اور اگر یقین نہیں تو آزما کے دیکھ لو''۔

وہ ایک بار پھر لپٹ پڑی اور کہا ''میں تو مزاق کر رہی تھی۔ تمہیں آزمانے سے پہلے میں خود کو کیوں نہ آزماؤں''۔

ابھی اُسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ ثانیہ مجھ سے جُدا ہوئی اور کہا ''جانے کا وقت ہو گیا ہے لیکن اگر خدا نے چاہا تو دوبارہ جلد ملیں گے''۔

یہ کہا اور دروازے کی طرف بڑھی کہ دوسری بار دستک ہوئی۔ مجھے شک ہوا کہ کوئی اور ہے اس لیے میں نے ثانیہ کو روکا۔

اُسے سمجھانے لگا ''لگتا ہے کوئی اور ہے اس لیے دوبارہ دستک دی ہے۔ میں۔۔۔ میں اُس کونے میں جاتا ہوں تم دروازہ کھولنا اگر کوئی اور ہوا تو کہنا کہ۔۔۔ میں بال کنگھی کر رہی تھی یا کپڑے بدل رہی تھی۔۔۔ بس جو دل میں آئے کہنا''۔

میں کونے میں جا کر چپ کر کھڑا ہوا وہ دروازہ کھولنے گئی۔ اُس نے دروازہ کھولا تو اُسی کی دوست تھی۔

ثانیہ نے اُسے کہا ''تم نے تو ہمیں ڈرا دیا تھا ہم نے سوچا کوئی اور ہے''۔

اُس نے ثانیہ سے کہا ''اُسے کہو کہ چلو ایسا نہ ہو کہ کوئی اور آ جائے اور کچھ مسئلہ بن جائے''۔

ثانیہ نے مجھے باہر آنے کا کہا۔ میں نے جاتے ہوئے اُس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ہم کب ایک ہونگے، کب تک ایک دوسرے سے دور رہیں گے، کب تک پل

پل مرتے رہیں گے، کب تک گوٹ گوٹ کہ جیتے رہیں گے''۔

ثانیہ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے مگر اُس کے دوست نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کہا ''جلدی کرو کوئی آ نہ جائے''۔

مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ کسی کی نظر میں آئے بغیر میں گھر سے باہر آ گیا اور اپنے گھر آ گیا۔ ایک بار ملنے کے بعد ہم دونوں کو چین نہیں آ رہا تھا کیونکہ ہم دوبارہ ملنا چاہتے تھے۔ ایسی جگہ جہاں ہم کچھ زیادہ وقت گزار سکیں۔ میں نے بہت سوچ کے بعد ایک اور پلین بنایا۔

جلال سے کہا کہ ''تم بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی کر لو اور ثانیہ چھٹی میں جان بوجھ کر دیر کر کے بس سے رہ جائے گی''۔

جلال نے کہا ''تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر خیال رکھنا ہمارے خاندان والے بہت سخت لوگ ہیں''۔

میں نے کہا ''بس دُعا کرنا دوست، ویسے بھی تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے''۔

جلال نے ویسے ہی کیا مگر اُس کے پاگل چچا نے کہا کہ ''ثانیہ بھی چھٹی کرے گی''۔

جلال نے کہا ''کچھ بھی نہیں ہوتا اُسے جانے دیں اُس کا سبق ضائع ہو جائے گا''۔

مگر وہ نہیں مانے۔ ثانیہ کو پتہ چلا کہ چچا نہیں چھوڑنے والے تو اُس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا کہ ''آج جانا بہت ضروری ہے اگر آج ٹیسٹ کے لیے نہیں گئی تو مس پرچے میں بھی فیل کر دے گی۔ جو کہ میں نہیں چاہتی''۔

اُس کے بار بار اسرار پہ اُسے چھوڑا گیا۔ ہم نے ویسے ہی کیا چھٹی پہ ثانیہ لیٹ ہوئی اور بس نکل پڑی۔ میں نے ضروری کام کا بہانہ کیا اور بس سے رہ گیا۔ سردیاں ختم ہونے پر یہاں ہر سال ایک بڑے میدان میں میلہ لگتا تھا۔ میں اور ثانیہ رکشے میں بیٹھ کر وہاں گئے۔ میرے دوست ان میلوں کے کافی شوقین ہیں مگر مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں تھا۔ میں یہاں پہلی بار آیا تھا۔ کافی بڑے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے۔ ثانیہ نے مجھے جھولے میں بٹھانا چاہا مگر مجھے ان چیزوں سے ڈر لگتا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اُس نے مجھے زبردستی بٹھایا۔ جھولا گھومنے لگا اور ہم اُوپر کو جانے لگے۔ میرا دل ڈر کے مارے گلے تک آ گیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر ثانیہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے قریب ہو گئی۔ تو میرا ڈر ایسے غائب ہو گیا کہ جیسے تھا ہی نہیں۔ جتنا وقت جھولا جھولتا رہا مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ کچھ وقت جھولتے رہے پھر اُتارا گیا۔ اُس کے بعد ہم بھوت بنگلہ گئے، موت کا کنواں دیکھا، جھولتی کشتی میں بیٹھے نیز ہر چیز دیکھی، ہر چیز میں بیٹھے۔ مگر ہم اُن خوشیوں میں کچھ بھول رہے تھے کہ ہمارے گھروں میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔

ثانیہ کہنے لگی ''کیا تمہیں یقین ہو رہا ہے کہ ہم دوبارہ ملے ہیں''۔

میں نے کہا ''ہاں! اب تو ملتے رہیں گے۔ بس خیال رہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے''۔

اُس نے کہا ''کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ چلو کچھ کھاتے ہیں مجھے بھوک لگی ہے''۔

مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا کہ کھانا کھایا ہے کہ نہیں کیونکہ آج وہ ساتھ تھی اور پھر بھوک، پیاس، غم، آنسو کی کیا مجال جو پاس آئے۔ قریب ہی ایک ریسٹورنٹ پہ اُسے لے گیا اور اُس کے پسند کے کھانے منگوائے گئے۔ مگر دوسری طرف ہمارے گھر والوں کی بھوک اُڑ گئی تھی ہماری راہ دیکھتے دیکھتے۔ اُن میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ ثانیہ کے ابو کبھی ڈرائیور کو فون کرتے کبھی سکول کہ ہماری بچی ابھی تک نہیں آئی۔ مگر ثانیہ کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ جلال کی سانس گلے میں اٹکے ہوئی تھی۔

پاگل چچا اُسے بار بار کوس رہے تھے کہ ''یہ سب تیری غلطی ہے تم نے کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوتا دیکھ لیا انجام۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو میں تیری جان لے لونگا''۔

اُس پاگل نے پورے شہر کو چھان مارا، ہسپتال دیکھے۔ جلال اس بات سے پریشان تھا کہ ایسا نہ ہو ہم ساتھ دکھ جائے۔ ایسا کچھ حال ہمارے گھر کا بھی تھا۔ ابو اڈے آئے ہوئے تھے اور ہر گاڑی میں مجھے دیکھتے تھے۔ میرا نمبر ملایا مگر بند تھا۔ بھائی اور کزن لوگ بھی مجھے ڈھونڈنے نکلے تھے۔ دونوں گھروں میں جیسے ماتم ہوا ہو سب ایسے رو رہے تھے۔ میرے نہ ہونے کی بات سارے گاؤں میں آگ جیسے پھیل گئی۔ ہر رشتہ دار کے گھر فون کئے گئے کہ وہ وہاں تو نہیں آیا مگر کچھ نہ بنا اور شک اور بھی بڑھ گیا۔ ثانیہ کے گھر والوں نے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ کیوں کہ جوان لڑکی گھر سے غائب ہے لوگوں کو پتہ چل جاتا تو طعنے ملتے۔

ان سب سے بے خبر ہم وہاں مزے سے بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔ کھانا ختم کیا تو میں نے اُس کے ہاتھ کو پکڑا اور اُس کی اُنگلیوں میں اُنگلیاں ڈال کر مضبوطی سے پکڑ کر کہا اس ہاتھ کو میں کبھی نہیں چھوڑونگا۔ اُس نے ہاتھ چھڑوانا چاہا مگر میں نے نہیں چھوڑا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ''چھوڑ میرا ہاتھ تم کون ہوتے ہو میرا ہاتھ پکڑنے والے''۔

میں نے نہیں چھوڑا اور کہا ''اب تو یہ نہیں چھوٹنے والا چاہے جو بھی کرلو''۔

تو وہ سنجیدگی سے کہنے لگی ''چھوڑ ورنہ میں شور کرونگی''۔

میں نے کہا ''کیا تم نے سُنا نہیں کہ میں نے کہا کہ نہیں چھوڑونگا''۔

وہ اور بھی سنجیدہ ہوئی ''تم میں تو بالکل شرم نہیں ہے کہا نہ کہ ہاتھ چھوڑ دو۔لوگ آئیں گے تو اچھا لگے گا؟''

میں سمجھا کہ وہ سچ میں سنجیدہ ہے اِس لیے میں نے چھوڑ دیا اور وہ ہنس پڑی کہ ''تم نے تو کہا تھا کہ میرا ہاتھ کبھی نہیں چھوڑو گے اتنی جلدی چھوڑ دیا۔اگر خدانخواستہ بُرا وقت آیا تو تم تو مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گئے''۔

مجھے اُس کا یہ مزاق اچھا نہیں لگا میں اُٹھا اور جانے لگا اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روکا اور کہا ''میرے مزاق کا اتنا بُرا مان لیا؟''

مجھے کرسی پہ بٹھایا اور کان پکڑ کر کہا ''پھر کبھی بھی ایسا مزاق نہیں کرونگی۔بس اب معاف کردو''۔

میں مسکرایا تو وہ سمجھ گئی۔کہنے لگی ''مجھے لگا تم خفہ ہو گئے ہو اس لیے میں نے کان پکڑے لیکن تم تو ہنس رہے ہو''۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تم نے مزاق کیا،کیا میں بدلہ نہیں لیتا''۔یہ کہ کر میں اور ہنسنے لگا۔

میرے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگی۔میں نے کہا ''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اب جانا چاہئے''۔

میں نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور کہا کہ ''میں تمہارے بعد والی گاڑی میں آتا ہوں''۔

وہ میرے پیچھے آنے لگی مگر میں نے اُس سے بات نہیں کی۔جب بھی میں اُسے دیکھتا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کہ یہ کہتی کے غلطی ہوگئی معاف کردو مگر اُس وقت میں تھوڑا غصے میں تھا اس لیے کچھ نہ کہ پایا۔اُسے گاڑی میں بٹھانے سے پہلے بس یہ کہا کہ

''تم اس گاڑی سے جاؤ میں اگلی سے آتا ہوں''۔

مجھے خفا دیکھ کر اُسے اپنے مزاق پہ افسوس ہوا مگر اُس وقت کچھ نہ کہ سکی۔

میرے ابو اب تک وہاں کھڑے تھے کہ ثانیہ کے تایا ابو (جلال کے ابو جو ڈاکٹر تھے) وہاں آئے اور میرے ابو سے بے چینی کا سبب پوچھا۔

تو ابو نے کہا کہ ''آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میرا بیٹا سکول سے اتنا لیٹ ہوا اور اُس کا فون بھی بند ہے۔مجھے تو فکر ہو رہی ہے''۔

جلال کے ابو کو شک ہوا۔(جلال کا بیمار ہونا،ثانیہ کا جانے پہ اسرار،گاڑی سے رہ جانا،میں بھی گھر نہیں آیا)۔مگر اُس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔

ابو نے اُن سے پوچھا ''ویسے تمہارا بیٹا بھی اُس کے ساتھ سکول جاتا ہے نہ اُس سے پوچھو''۔

اُس نے ابو سے کہا کہ ''وہ تو آج بیمار تھا اور سکول نہیں گیا تھا۔آپ فکر مت کریں میں ویسے بھی اُسی طرف جا رہا ہوں مجھے ملا تو ساتھ لے آونگا''۔

ابو اور ثانیہ کے خاندان والے آپس میں جاننے والے تھے اور جلال کے ابو تو مجھے بھی جانتے تھے۔ثانیہ کے دونوں چچا،پاگل اور ڈاکٹر،اُسے ڈھونڈ رہے تھے کہ اُس کے گھر آنے کی خبر اُن کو مل گئی اور کچھ دیر بعد میں بھی گھر آ گیا۔میرے چچیاں پھپیاں وغیرا مجھے پیار سے گلے لگا رہی تھی اور ایک ابو تھے کہ بے عزتی پہ تُلے ہوئے تھے۔

ثانیہ کا گھر آنا تھا کہ اُن کے گھر والوں کے لیے قیامت ٹل گئی۔مگر اُس کے لیے دونوں چچا مصیبت بن سکتے تھے۔اُس کے ابو اور امی اس بات پہ خوش تھے کہ وہ صحیح سلامت گھر آ گئی ہے اس لیے اُنہوں نے کوئی وجہ نہیں پوچھی۔ثانیہ کے گھر آنے کی خبر دونوں چچا کو مل گئی اور وہ بھی گھر آ گئے۔تایا آتے ہی سوال کرنے لگے۔

''کہاں تھی؟دیر سے کیوں آئی؟''

پاگل چچا نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ''ارے بیچاری کو سانس تو لینے دے''۔

ثانیہ نے جواب میں کہا ''میں وہاں ہی تھی جہاں روز گاڑی کا انتظار کرتی ہوں۔ایک دوست کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اس لیے گاڑی کب آ کر چلی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔اُس دوست کا گھر قریب ہی تھا اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے کر گئی اور کھانا کھلایا۔اس لیے دیر ہوگئی''۔

تایا نے غصہ میں کہا ''کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ تمہارے وقت پہ گھر نہ آنے سے کتنی پریشانی ہو سکتی ہے؟''۔

پاگل چچا نے بھائی کو اُسے کوسنے سے روکا ''اب بعشوں بھی بچاری کو آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے ڈرائیور سے کہ دیا ہے کہ جب تک ثانیہ نہ آئے بس سٹارٹ تک مت کرنا''۔

تایا ''مجھے تو ڈر ہے کہ یہ خود نہ بس سے رہ گئی ہو''۔

ثانیہ کو تایا کے آنکھوں میں شک کی لہر نظر آئی مگر اُس کے کہنے سے پہلے اُس کے چچا نے جواب دیا۔

''پاگلوں سی باتیں مت کرو وہ بھلا ایسا کیوں کریگی''۔

مگر جلال کے ابو آرام سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔

میرے ابو کو کال آئی ''ہیلو!۔۔۔۔ہاں وہ ابھی پہنچ گیا۔۔۔۔۔بہت اچھا۔۔۔اچھا جی خدا حافظ''۔

جلال کے ابو کا فون تھا وہ یہ تصدیق کر رہے تھے کہ میں آیا ہوں کہ نہیں کیونکہ ثانیہ تو آ گئی تھی۔ یہ ملاقات ہمیں بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ اُس واقعہ کے بعد ہمارے لیے ہمارے درمیان دیواریں اور بھی اُونچے ہو گئیں۔ ثانیہ کے تایا نے اُس کے ابو سے بات کی کہ ''اُسے آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

لیکن ثانیہ کے ابو نہ مانے اُنہوں نے کہا کہ ''میں اُس کو پڑھانا چاہتا ہوں''۔

تایا غصہ ہوا اور کہا ''تب یہ بھی سُن لو کہ اگر اُس نے کچھ ایسی حرکت کی کہ جس سے ہمارے خاندان کی بدنامی ہو تو میں خود اُسے جان سے مار دونگا''۔

ثانیہ کے ابو نے کہا ''ایسی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ میری بیٹی ایسے نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ جو ہوا وہ اتفاق تھا''۔

تایا نے اُسے خبردار کرتے ہوئے کہا ''جو بھی تھا لیکن اگر سچ ہوا تو میری بات یاد رکھنا''۔

وہ بولے ''تمہیں بس صرف شک کرنا آتا ہے''۔

تایا کہنے لگے ''دعا کرو کہ شک شک ہی رہے سچ نہ ہو جائے''۔

ثانیہ کے ابو نے مشورہ دیا کہ ''اچھا تم ایسے کرو کہ اُس کی گاڑی تبدیل کرو''۔

تایا نے یہ بات پہلے سے سوچ رکھی تھی ''وہ تو ضرور کرونگا لیکن اب اگر وہ لڑکا بھی آیا تو زندہ نہیں رہے گا''۔

ثانیہ کے ابو نے اُنہیں اطمینان دلایا کہ ''ایسا نہیں ہوگا میں ثانیہ سے بھی بات کرتا ہوں''۔

وہ بولے ''ہاں ضرور کرو اور اُسے سمجھا دینا کہ ہم دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں ہمیں اندھا اور بہرہ نہ سمجھے''۔

ثانیہ کے ابو نے کہا ''بس تم ٹھنڈے ہو جاؤ اور اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو''۔

اگلے دن جلال اور ثانیہ گاڑی میں نہیں تھے۔لیکن سکول میں جلال سے ملا۔ تو پتہ چلا کہ اُن کی گاڑی تبدیل کرائی گئی ہے۔

جلال نے مجھے کہا ''اُن کو تم اور ثانیہ پہ شک ہے''۔

میں نے دانت بجاتے ہوئے کہا ''وہ سمجھتے کیوں نہیں''۔

اُس نے کہا ''اُنہیں سمجھانا ناممکن ہے''۔

میں نے غمگین آواز میں کہا ''مگر میں اُس کے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

وہ کہنے لگا ''ایک حرکت سے اُسے اپنے آپ سے دور کر چکے ہو، اس لیے ایسی حرکت مت کرنا کہ پھر اُسے دیکھنے کے لیے ترس جاؤ''۔

میں لاچار تھا ''اب میں کیا کروں؟''

جلال نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا ''کچھ وقت کے لیے کچھ مت کرو نہ کچھ سوچو۔ اس معاملے کو ٹھنڈا ہونے دو''۔

میں نے کہا ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں اُسے ملوں بھی نہ''۔

اُس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا ''ہاں! اگر تم ہم سب کی بھلائی چاہتے ہو۔ ورنہ کیا ہوگا یہ تو تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا''۔

میں بولا ''میری بات سنو۔۔۔۔''۔

وہ بات کاٹ کر بولا ''نہ! تم میری بات سنو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم اُسے دیکھ سکو تو اور کچھ مت کرنا ورنہ اُسے ساری زندگی گھر میں ایک قیدی کی طرح گزارنی ہوگئی۔ یا تو اُس کی منگنی کرا دینگے''۔

میری آواز میں بے بسی تھی ''ایسا تو مت کہو نہ یار''۔

جلال میری بھلا چاہتا تھا اس لیے وہ بات منوانا چاہتا تھا ''ہر بار میں تیری مانتا رہا ہوں آج کے دن میری مان لے''۔

میں چُپ کھڑا رہا۔ تو جلال نے کہا ''میرے لیے''۔

میں نے کہا ''کب تک؟''

اُس نے جواب دیا کہ ''جب تک حالات ٹھیک نہ ہو جائیں''۔

میں نے اُس کی خاطر یہ بات مان لی۔ دور سے ثانیہ کو دیکھتا اور جب موقع ملتا اُس سے فون پہ بات کرتا۔ یہ ہمارے لیے ایک سخت وقت تھا۔ تھوڑے عرصہ ہی ساتھ رہے تھے کہ جُدائی کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ پہلے تو نیند نہیں آتی تھی اور جب سوتا تو غموں کے ساتھ۔ لیکن نیند میں بھی چین نہیں تھا وہ ہر خواب میں۔ تو اس بات کے ڈر سے کہ ایسا خواب نہ دیکھ لوں جس میں کچھ بُرا ہو اس لیے اُٹھنا پڑتا مگر غموں کے ساتھ۔ سکول جاتا تو اس غم کے ساتھ کہ اُسے دیکھ پاؤں گا کہ نہیں، واپس آتا تو اس غم کے ساتھ کہ آج فون پہ بات ہو گی کہ نہیں۔

جب بھی فون پہ بات ہوتی وہ روتی رہتی کہ ''اب کیا ہوگا؟ مجھ سے تو رہا نہیں جاتا''۔

میں خود دل ہی دل میں روتا رہتا مگر اُسے دھلاسے دیتا تھا کہ ''کچھ ہی وقت کی بات ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''۔

کہنے لگی ''اس وقت تک میرا دم نہ نکلا ہو''۔

میں اُسے دھلاسہ دیتا ''خدا پہ بھروسہ رکھو''۔

وہ مجھ سے زیادہ بے چین تھی ''وہ تو ہے مگر تم مجھے بھگا کے لے چلو''۔

میں نے انکار کرتے ہوئے کہا ''کبھی نہیں''۔

اُس نے کہا ''کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے؟''

میں نے جواب دیا ''کرتا ہوں، بہت زیادہ لیکن بھگا کہ میں تیری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا''۔

وہ بولی ''اس سے تو اچھی ہوگی''۔

وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی اور میں اُسے سمجھانا چاہتا تھا ''ایسا نہیں ہوتا۔ دو دن میں ڈھونڈ کر مار دینگے''۔

اُس کی تکلیف مجھے محسوس ہوئی، اُس نے کہا ''مار دے، یہ پل پل کے مرنے سے تو اچھا ہوگا''۔

میں چپ رہا تو کہنے لگی ''اور تیرے لیے مرونگی تو فخر کرونگی کہ میرا پیار سچا تھا''۔

وہ مجھ سے زیادہ بے چین تھی مگر میں اور کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔

ثانیہ ''ایک بات پوچھوں؟''۔ میں نے کہا ''ہاں! پوچھو''۔

کہنے لگی ''آج کل جب بھی تمہیں دیکھتی ہوں تم پریشان ہوتے ہو۔ تو پلیز کسی بھی وجہ سے اپنی مستی مت چھوڑنا کیونکہ تم اُچھلتے کودتے اچھے لگتے ہو۔ خفہ ہوتے ہو تو بالکل اچھے نہیں لگتے۔ یہ سوچ کر خوش رہنا کہ تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں''۔

میرے آنکھوں میں آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے اُسے کہا ''اور ایک بات تم میری مانو کہ آئندہ کبھی بھاگ جانے کی بات نہیں کرو گی''۔

وہ ہنس کر بولی ''توبہ جناب نہیں کرونگی بس''۔

اس بار بھی میرا گرمیوں کے چھٹیوں کی خوشی منانے کا اِرادہ نہیں تھا مگر ثانیہ کو دکھانے کے لیے میں نے مستی کی اور کالی سیاہی سے داڑھی مونچھیں بنوائی ہوئی تھیں۔

اُس روز فون پہ بات ہوئی ثانیہ ''تم آج بہت اچھے لگ رہے تھے''۔

میں نے کہا ''مطلب؟''۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی ''مطلب یہ کہ داڑھی میں بہت اچھے لگ رہے تھے''۔

میں نے پوچھا ''تم میرا مزاق اُڑا رہی ہو؟''۔

کہنے لگی ''نہ بابا نہ! میں سچ کہہ رہی ہوں میرا مشورہ ہے کہ تم داڑھی رکھو، مجھے اچھا لگے گا''۔

اُس کے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''جو حکم جناب کا۔ میری زندگی تو تمہاری ہے جو مرضی کرالو''۔

وہ بولی ''ہر حکم مانو گے؟ اچھا یہ بات ہے تو پھر ایسا کرو کہ۔۔۔ مجھے کہیں پہ گھمانے لے چلو''۔

میں نے کہا ''واہ جی، ایک بندہ بھوک سے مر رہا ہے اور دوسرا اُس کے تکیئے تلے پراٹے ڈھونڈ رہا ہے''۔

وہ بولی ''میں کچھ سمجھی نہیں''۔

میں نے سمجھاتے ہوئے کہا ''مطلب یہ کہ ہم پانچ منٹ کے لیے مل نہیں سکتے اور تم کہیں گھمالے جانے کا کہہ رہی ہو''۔

تو اُس نے کہا ''تم بہت ڈرپوک ہو''۔

میں نے غیرت میں آ کر کہا ''آزما کے دیکھ لو''۔

وہ سوچ کر بولی ''تو ایسا کرو کہ کبھی ہمارے جگہ آؤ تو مان لونگی کہ تم ڈرپوک نہیں ہو''۔

میں نے جواب دیا ''یہ خواہش بھی پوری ہو جائیگی جلد ہی''۔

چھٹیاں گزرنے لگی اور ایسی ہی گزر گئی۔ کئی دفعہ بات ہوئی مگر کئی مہینے ہوگئے تھے کہ ہم ملے نہیں تھے۔ ہم دونوں ملنے کے لیے بے چین تھے مگر حالات جنگل کی آگ کی طرح تھے زیادہ ہو رہے تھے مگر تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ثانیہ تو دور کی بات جلال بھی مل نہیں سکتا تھا۔ اگر بات ابھی چُھپی ہوئی تھی تو وہ ہمارے خاندان والوں سے مگر وہ بھی کچھ زیادہ دیر تک نہیں۔ میں اور ثانیہ ملنے کے کچھ منصوبہ بنا رہے تھے مگر کچھ فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے بالاکوٹ کے زلزلے نے پورے پاکستان کو ہلا دیا تھا مگر میرے زندگی کے حالات اُس سے تین دن پہلے ہل گئے تھے۔ ۵ اکتوبر کو میں اور ثانیہ بات کر رہے تھے۔

ثانیہ کہنے لگی ''میری پرواہ مت کرو اگر میری زندگی داؤ پہ بھی لگی ہو تو میں آؤنگی''۔

میں نے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا کہ ''نہ کبھی نہیں۔ اگر تمہیں پتہ لگے کہ کچھ گڑبڑ ہونے کا خطرہ ہے تو کبھی مت آنا میں سنبھال لونگا''۔

وہ بولی ''تم کچھ دیر میرا انتظار کرو میں ضرور آؤنگی''۔

میں نے کہا ''انتظار تو میرے مقدر میں ہے''۔

کہنے لگی ''بس تو ڑا اور۔۔۔۔۔۔ آآ آہ آآ آ''۔ وہ چِھلائی۔

میں نے پوچھا ''ثانیہ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''۔

فون میں ثانیہ کی چیخیں آ رہی تھیں اور ساتھ میں پاگل چچا اُسے مارتا ہوا چلا رہا تھا۔ اُس نے ثانیہ کی باتیں سُن لی تھیں اور اُسے بالوں سے پکڑ کر مار رہا تھا ''بے غیرت، بے شرم میں تو سوچ رہا تھا کہ سب قصور اُس کا ہے مگر ابھی پتہ چلا کہ تم بھی اُس میں برابر کے شریک ہو''۔

مسلسل ثانیہ کے چیخیں آ رہی تھیں اور وہ پاگل اُسے بے دردی سے مار رہا تھا لیکن افسوس کہ میں کچھ نہ کر پایا۔ ثانیہ کی آواز سُن کر اُسے بچانے کے لیے اُس کی امی اور چچی آئی اور اُس پاگل سے بہت مشکل سے چُھڑا کے لے گئیں۔ موبائل توڑ دیا گیا۔ میں کیسے برداشت کرتا کہ کوئی میرے جگر کے ٹکڑے کو ایسے مارے، پورا دن اور پوری رات میرے کانوں میں

وہ چیخیں گونج رہی تھی۔ پوری رات روتا رہا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا اور میں کچھ نہ کر پایا۔ اس لیے میں اگلے دن ثانیہ کے ہجرے چلا گیا۔ وہاں پاگل، ثانیہ کے ابو اور کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی میں اندر گیا۔

اُس پاگل نے مجھے دیکھا تو کہا ''وہیں سے واپس ہو جاؤ۔ میرے ہاتھوں کو اپنے خون سے مت رنگنا''۔

میں ڈر گیا تھا اور اُسے دیکھ کر اور اُس کی دھمکی سن کر زمین پاؤں تلے کسک گئی۔ مگر ثانیہ کے چیخوں نے اور اُس کے ساتھ کئے ہوئے وعدے یعنی کہ 'میں وہاں آؤنگا' اُس کی وجہ سے وہیں کھڑا رہا۔

وہ پھر چلا کر بولا ''تم جاتے ہو کہ نہیں''۔

یہ کہ کر وہ میری طرف بڑھنے لگا کہ ثانیہ کے ابو نے روکا اور کہا ''میں دیکھتا ہوں (میرے پاس آ کر) تم کیوں آئے ہو۔ کیا اپنی جان پیاری نہیں''۔

میں اُن کے پاؤں پڑ گیا، رونے لگا اور کہا ''اس میں ثانیہ کا کوئی قصور نہیں سب میرا ہے۔ مہربانی کر کے اُسے کچھ مت کہیئے''۔

اُنہوں نے اپنے پاؤں پیچھے کئے ''تم نے ہمیں اس پہ مجبور کیا کہ ہم اُس کے ساتھ ایسا کریں۔ اگر تم اُس کی خوشی چاہتے ہو تو دوبارہ نہ یہاں آؤ، نہ اُس سے بات کرو، نہ اُس سے ملنے کی کوشش کرنا''۔

پاگل نے میری طرف آتے ہوئے کہا ''مجھ پہ چھوڑ دو اگر یہ تسلیم کر رہا ہے کہ سارہ جُرم اس کا ہے تو (پستول نکالتے ہوئے) اس کو سزا ملنی چاہئے''۔

مہمانوں نے یہ دیکھا تو جلدی سے اُسے پکڑ لیا کہ بیچ میں گولی نہ مار دے۔

ثانیہ کے ابو بولے ''جاؤ یہاں سے اپنے لیے اور ہمارے لیے اور مصیبتیں مت پیدا کرو''۔

ڈر کے مارے میرے جسم کا سارہ خون جم گیا تھا، رگیں سکڑ گئی تھیں، رینگنے کی مانند میں وہاں سے روانہ ہوا اور اپنے گھر آتے آتے کافی وقت لگ گیا۔ مگر تماشا تو یہاں عروج پہ تھا۔ ابو نے میرے کمرے کا سارا سامان صحن میں پھینک دیا تھا جس میں میرا کمپیوٹر بھی تھا۔ یہ وہی کمپیوٹر تھا جو ابو نے پیار سے خرید کے دیا تھا۔ مگر مجال تھی کسی کی کہ اُنہیں روکنے کے لیے آگے ہوتے۔ سارے گھر والے، کزن، تایا وغیرہ سب جمع تھے۔ بس میرا انتظار ہو رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی ابو مجھ پہ ٹوٹ پڑے۔ سب مل کر چھڑا رہے تھے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کوئی بھی کامیاب نہ ہوا اور اتنا مارا کہ سب سمجھ گئے کہ یہ تو مر جائے گا۔ مگر اُن کا دل نہیں بھرا آخر تھک گئے تو چھوڑ دیا۔ میں کیسے بتاؤں کہ کیسا تھا۔ اگر اندازہ لگاؤ تو شاید ایسا تھا کہ ایک شخص تین، چار منزلہ عمارت سے گر جائے اور پھر کوئی گاڑی کچل دے اور باقی کسر پوری کرنے ایک اور شخص آئے اس کا گلہ دبائے۔ بدن تو بدن اُنگلی بھی ہل نہیں رہی تھی۔ سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ کس نے اُٹھایا اور کون ہسپتال لے کر گیا کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہوش آیا تو گھر کی ساری عورتیں جمع تھی اور میرے حالتِ زار پہ رو رہی تھیں۔ سب پیار کر رہے تھے تو احساس ہوا کہ درد تب ہوتا ہے جب پیار کرنے والے کو درد ملتا ہے۔ میرا درد تو اپنا تھا مگر ثانیہ کا درد بھولا نہیں۔

اُس دن کے حالات نے میرے سارے اِرادے توڑ دیئے تھے مگر میری ہمت برقرار تھی۔ دو، چار دن ہسپتال میں گزار کے مجھے گھر لے آئے۔ لیکن ابو کا غصہ تیز بخار کی طرح تھا اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ابو نے غصہ میں کہا ''اِس سے کہو کہ اس گھر سے چلا جائے۔ نہیں چاہئے مجھے ایسا بیٹا''۔

کوئی کچھ نہ بولا ابو بولتے رہے ''اس سے اچھا ہوتا کہ وہ لوگ مجھے فون کرنے سے پہلے ہی اِسے مار دیتے اور مجھے بتائے بغیر دفن کر دیتے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا''۔

تایا نے ابو کو سمجھایا کہ بات کو آگے نہ بڑھاؤ مگر وہ لگے رہے۔ تایا، مسعود بھائی اور گھر کے اور بڑے جمع ہو کر میرے کمرے میں آ گئے۔

تایا نے بھی مجھ پہ غصہ نکالتے ہوئے کہا ''شکر کرو ہم وہاں تھے ورنہ وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑتا''۔

میں نے جواب دیا ''اُنہوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی''۔

تایا بھڑک اُٹھے ''تمھیں کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔ ایک لڑکی کے لیے تم ہم سب کی عزت کو مٹی میں ملانا چاہتے ہو''۔

اُنہوں نے مثالیں دینا شروع کیا ''ہمارے معاشرے میں اسلامی شریعت ہے بھولو مت کہ تم بھی اُس کا حصہ ہو''۔

مجھے بولنے کا موقع ملا ''کونسی شریعت، کیسی شریعت۔ خود اپنی مرضی کے کرتے ہیں اور جب میں اپنی مرضی کا کام کرتا ہوں تو مجھے روک لیا جاتا ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ خود

چلا کے بات کرتے ہیں اور میں آرام سے کچھ بولوں تو وہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ اپنی اولاد کی خواہشوں کا گلا گھوٹ کر اپنی بات منوانا کہاں کی، کس کی شریعت ہے۔ ایسا میں نے اسلام میں کبھی نہیں سُنا''۔

میرے دل کا بوجھ ابھی ہلکا نہیں ہوا تھا کہ مسعود بھائی نے روک لیا۔

تایا کو اور غصہ آیا کہ میں نے ایسا جواب دیا ''تم اتنے بڑے ہوگئے ہو کہ مجھ سے زبان لڑا رہے ہو۔ شکر کرو مجھے تم پہ ترس آ گیا اس لیے میں نے کچھ کہا نہیں ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے ابھی بھی کم مارا کیونکہ تمہارا دماغ ابھی بھی جگہ پہ نہیں ہے''۔ وہ یہ کہ کر غصے میں چلے گئے۔

مسعود بھائی کہنے لگے کہ ''اپنا دماغ ٹھیک کرو ایسا اور نہیں چلے گا۔ ابو کو اس بار بھی بڑی مشکل سے منایا اور اگر دوبارہ ایسا ہوا تو میں خود تمہیں گھر سے نکالونگا''۔

سب بڑے بڑے آئے اور اپنے اپنے دل کا بوجھ وغصہ مجھ پہ نکال کے چلے گئے۔ ایک طرف پورا جسم جلا ہوا تھا تو دوسری طرف یہ لوگ نمک ڈال رہے تھے۔ سب سے آخر میں شہزاد آیا وہ کہنے لگا ''تم نے جو کیا اچھا کیا مگر پھر بھی وہاں اکیلے نہیں جانا چاہئے تھا وہ کچھ بھی کر سکتے تھے''۔

میرے چہرے پہ اُداسی تھی۔ میرا پریشان چہرہ دیکھ کر شہزاد بولا ''پریشان نہ ہو جو گرجتے ہے وہ برستے نہیں۔ کچھ دن کی بات ہے بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''۔

شہزاد کی باتوں سے مجھے بہت تسلی مل گئی کہ چلو ایک تو کم از کم میری طرف ہے۔

ثانیہ کا سکول تک تبدیل کر دیا گیا۔ میری جیب خرچ بند ہوگئی۔ تب سے شہزاد نے مجھے سپورٹ کیا۔ میری زندگی سے اُس کا نام مٹانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ بڑے ہمیشہ یہ سوچ کر اپنی بات منواتے ہیں کہ ہم صحیح فیصلہ کرتے ہیں مگر زیادہ تر اُن کو اپنے اس فیصلے پہ پچھتانا پڑتا ہے کیونکہ آنا پہ کیا گیا فیصلہ اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔ ہماری محبت کی وجہ سے اُن کو اپنی انا دیکھانے کا موقع ملا جس میں ہم قربانی کے بکرے بنے۔ میں ثانیہ کے پیچھے بھی نہیں گیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے میری وجہ سے کوئی اور دکھ ملے۔ جلال بھی اُسی کے ساتھ تھا اور اُس کے بعد وہ بھی نہیں ملا تھا اور اس کے ساتھ ہی رابطے کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ میری ایک ٹانگ میں دو ہفتہ تک درد ہوتا رہا جس کی وجہ سے میں لنگڑا چلتا تھا۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے مگر ابو، تایا اور دوسرے گھر کے بڑوں کا رویہ ویسے ہی رہا۔ دوسری طرف ثانیہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مہینہ گزر گیا تھا کہ میں نے گھر میں بات تک نہیں کی تھی۔ بس انتظار کر رہا تھا اُس وقت کا کہ حالات اچھے ہو جائیں۔

بہت بے چینی کے بعد ثانیہ نے جلال کو ایک خط دیا جو کئی لوگوں کے ذریعے مجھ تک پہنچا۔ اس کے الفاظ کے ساتھ اُس کے آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کی سسکیاں سُنائی دے رہی تھی اور اُس کا پیار جھلک رہا تھا۔

پہلے اُس نے معذرت کی کیونکہ میں نے یہ بات کرنے سے منع کیا تھا اور کہا کہ ''اگر تم مجھے بھگا لے کر جاتے تو یہ دیکھنا نہ پڑتا دو دن تو ساتھ میں گزار لیتے چاہے وہ بعد میں مار کیوں نہ دیتے۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا تو موت کو بھی ہرا دیتی۔ میں تمہارا انتظار موت تک کرونگی اور میں التجا کرتی ہو کہ میری پرواہ مت کرو کیونکہ میں جیسے بھی ہوں ٹھیک ہوں خوش ہوں۔ بس یہ سوچا کرو کہ تم ٹھیک ہو تو میں بھی ٹھیک ہونگی۔ باتیں تو بہت ہے مگر وہ کہنے کی ضرورت نہیں وہ تم جانتے ہو کیونکہ ہمارے دل سے دل تک راہ ہے۔ آخری یہ کہ مجھے تمہاری غیرت کی قدر ہے تم نے اپنا وعدہ پورا کیا یہاں آ کر اور ہمیشہ رہے گا اور میرے وجہ سے جو بھی دُکھ ملے اُس کے لیے معاف کرنا کیونکہ میں تم جیسے غیرتی نہیں ہوں۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ دعا کرنا، تمہارے لیے دُعا گو 'ثانیہ'''۔

میں وہ خط سینے سے لگا کر روتا رہا اور دن میں کئی بار پڑھا اور ہر بار پڑھ کر روتا رہتا۔ میں اُسے خط نہ لکھ پایا۔ ہر دن سال کی طرح گزرتا تھا جس میں بہار کے علاوہ تینوں موسم ہوا کرتے تھے۔ شدید گرمی، شدید سردی اور حزاں۔ گھر والوں کی گرمی، قسمت کی سردی اور دل پہ حزاں کے موسموں سے بہار ڈر کے آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہر اگلا دن پچھلے سے سخت ہوتا تھا۔

لوگ نئے سال کی خوشیاں منا رہے تھے اور میں اپنی جُدائی کا ماتم کر رہا تھا۔ اِن تین سالوں میں کسی کی بھی شروعات اچھی نہیں ہوئی۔ مگر اُمید کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کئی ہفتوں بعد وہ جلال کو خط دیتی اور جلال بازار آنے کے بہانے نکلتا اور میرے قریب جاننے والے کو وہ امانت کے طور پہ سونپ دیتا تھا کہ وہ مجھ تک پہنچائے۔

''مجھے افسوس ہے تم سے اتنا دور ہو کر بھی جی رہی ہوں۔ پتہ نہیں تم پہ کیا بیت رہی ہوگی مگر میں ملنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ چاہئے ایک پل کے لیے سہی مگر جتنی جلدی ہو سکے ایسا نہ ہو رو رو کے میری بینائی لُٹ جائے، میری آواز چلی جائے جو کہ میں مل کر چاہ کر بھی نہ تمہیں دیکھ سکوں نہ بول سکوں۔ لیکن مجھے رونا دھونا سب منظور ہے جب پاس تم ہو اور ہنسنا بھی

نا گوار جب تم دور ہو، دل تو تم فدا تھا اب یہ جان بھی تیرے لیے فنا ہو گئی''۔

میں چاہ کر بھی اس کی یہ باتیں پڑھ کر رونے سے اپنے آپ کو روک نہیں پاتا تھا۔ میرے رونے کا منظر، میری تنہائی، میری تڑپ میرے کمرے کے دو یواروں نے بھی دیکھی ہیں۔ مگر وہ بھی میری طرح خاموش ہے نہ دل کا حال کسی کو بتا سکتے تھے نہ کسی کو بہلا سکتے تھے۔ اُسکے لکھے ہوئے خطوط کو پتہ ہے کہ کتنی بار میں نے اُس کو پڑھا ہے اور اُس کو پڑھتے ہوئے میرے کتنے آنسوں گرے ہیں۔ میں ٹوٹ کے زروں میں بکھر گیا تھا کیونکہ مجھے دوری، تنہائی، آنسوں اور نفرت نے توڑ دیا تھا۔

کئی خط ملے وہ ہر خط میں ملنے کی خواہش ظاہر کرتی مگر میں کچھ نہ کہ پاتا۔ میں حالات کے شکنجوں میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ ایک طرف گھر والوں کی گرم مزاجی، تو دوسری طرف ثانیہ سے ملنے کی آرزو۔ ایک طرف ہمیں ساتھ دیکھے جانے پہ ثانیہ کے لیے ازیت، تو دوسری طرف اُس کے معصوم اسرار۔ اُس کا اسرار سب پہ غالب آ گیا اور میں نے خط لکھ دیا جس میں دن، وقت سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ جب بھی بازار جاتا اُسے جیب میں لے کر جاتا کہ جلال نظر آئے اور اُسے کسی طرح دے دوں۔ کئی دن تک میں مسلسل بازار گیا مگر وہ نہ ملا۔ لیکن میں جاتا رہا آخر وہ ایک دن دور سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ جب وہ قریب آیا اور مجھے دیکھا تو میں نے اُسے ٹکر ماری اور وہ خط اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے بہت سوچنے کے بعد ایسا کیا تھا اور اگر سب میرے سوچنے کے مطابق ہو جائے تو کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا۔

خط میں لکھے ہوئے دن کی صبح سویرے میں ضلع کے مین بازار پہنچا اور وہاں سے ٹیکسی لے کر واپس گاؤں آیا۔ کیونکہ گاؤں کے سارے ٹیکسی ڈرائیور مجھے جانتے تھے اور گھر بات پہنچ سکتی تھی۔ ثانیہ کو میں نے کہا تھا کہ سکول جانے کے وقت سے پہلے نکلنا ہے۔ جب میں ٹیکسی لے کر پہنچا تو وہ وہاں کھڑی تھی، جلال بھی ساتھ تھا۔ میں جلال سے گلے ملا جس کا موقع بہت عرصے بعد ملا۔

میں نے آنکھوں میں آنسو لیے کہا ''میں بڑا بد قسمت ہوں کہ تم دونوں سے ایک ساتھ جدا ہوا۔ میں ہر چیز بھول جاؤنگا لیکن تیرے احسان کبھی نہیں بھول سکتا''۔

جلال نے اطمنان سے کہا ''میں نے احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض نبھایا ہے''۔

جلال ''تم سے دور ہونے سے تیری دوستی کی قیمت اور بھی بڑھ گئی''۔

میں نے کہا ''دوستی میں نے نہیں بلکہ تم نے نبھائی ہے اور میری زندگی میں تم جیسا اور کوئی دوست نہیں آ سکتا۔ (میں مسکرا کہ بولا) اچھا چلتا ہوں وقت زیادہ نہیں ہے۔ خدا خافظ''۔

اُس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے کہنے لگا ''خیال سے جانا''۔

میں اُس سے جُدا ہوا اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جب ثانیہ کے سکول کی گاڑی آئی تو جلال نے کہا کہ ''وہ آج نہیں جا رہی''۔

میں ثانیہ کے ساتھ پچھلے سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا اور اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اُس کے آنکھوں میں عجیب سی خوشی تھی جو کہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سارے راستے وہ چپک کے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی پیاری چیز کسی کو واپس مل جائے اور وہ اُسے دل سے لگا لیتا ہے۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم نے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ مگر جو اُس کے دل میں تھا وہ سب میں نے سُن لیا، محسوس کیا، سمجھ لیا۔ وہاں جاتے ہی اُس نے اپنے دل کی ساری باتیں مجھے بتا دیں۔ جو کہ مجھے پتہ تھی لیکن میں سنتا رہا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کمزور ہو چکی تھی مگر تب بھی بہت پیاری لگ رہی تھی میرا دل اُسے دیکھنے سے نہیں بھر رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اُسے لے کر بھاگ جاؤ کیونکہ مجھے اُس سے اور جُدا نہیں رہنا تھا مگر کیسے اور کہاں لے جاتا؟

اُس کے کہنے پہ پہلے ہم باغ ناران گئے۔ وہاں پہ کافی وقت گزارہ سارہ وقت وہ بولتی رہی بس بولتی رہی۔ اُس کے دل پہ جتنا غم، درد تھا سب بول کے ہلکا کر ڈالا۔ مجھے اچھا لگا کہ وہ اتنے دنوں بعد خوش ہو کر ہنس کر اور جینے کی باتیں کر رہی تھی۔ اتنے وقت میں اُس نے مجھے ایک جملہ کہنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ مجھے موقع چاہئے تھا کہ میں کچھ کہوں یا کروں۔ اس لیے میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے موقع کا فائدہ اُٹھایا اُسے گلے لگ کر ہونٹوں پہ کِس کیا۔ اُس نے اپنے آپ کو زبردستی چھڑا لیا اور شرما کر ایک طرف ہو گئی۔ میرا دل نہیں بھرا تھا اس لیے میں اس کی طرف بڑھا مگر وہ دور ہو گئی اور کہا ''بے شرم بس کرو نہ کوئی دیکھ لے گا''۔

میں اُس کی طرف بڑھا اور کہا ''کوئی نہیں ہے بس ایک بار''۔

اُس نے منہ موڑتے ہوئے کہا ''نہیں ورنہ میں چلاونگی''۔

''او!''۔ یہ کہ کر میں نے اُسے دوبارہ پکڑ لیا اور اُس نے اپنا منہ چُھپا لیا تھوڑا تنگ کر کے میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ شرم کے مارے سکڑی ہوئی تھی۔

میں نے کہا ''اگر بُرا لگا ہو تو سوری''۔

وہ بولی ''نہیں ایسی بات نہیں ہے''۔

میں ہنس کر بولا ''مطلب کہ اچھا لگا تو ایک بار پھر ہو جائے''

وہ ڈر کے بولی ''نہ پلیز اور نہیں ابھی بھی دل بہت زوروں سے دھڑک رہا ہے''۔

میں کہنے لگا ''اچھا جی اور نہیں کرتا۔ چلو کہیں اور چلتے ہیں''۔

اُس نے کہا ''مجھے کپڑے لینے ہیں''۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے صدر جاتے ہیں''۔

وہاں سے صدر پہنچے۔ اُس نے کہا کہ R-SHEEN جانا ہے۔ جو کہ کپڑوں کی ایک مشہور اور بڑی دکان ہے۔ آئس کریم لے کر ہم اُس دکان کی طرف جانے لگے کہ کسی نے پیچھے سے کہا ''اوے!''

میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ میرے ذہن میں اُس لمحے میں کئیں لوگوں کے چہرے آئے۔ میں ڈر گیا تھا ایک میں گھر سے بن بتائے آیا تھا، دوسرا کہ ثانیہ ساتھ تھی، تیسرا کہ ہم پشاور میں تھے اور چوتھا یہ کہ ہمیں ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوچا کہ بھاگ جاؤ مگر ثانیہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جب مجھ سے کچھ سوچا نہ گیا تو سب خدا پہ چھوڑ کر مڑ گیا۔ تو ایک آدمی میرا گرا ہوا رومال لے کر میرے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے کہا کہ ''بھائی صاحب بٹوا نکالتے ہوئے آپ سے گر گیا تھا''۔

سامنے تو میں نے اُس کا شکریہ آدا کیا مگر دل ہی دل میں گالیاں دے رہا تھا۔ اگر میرا بٹوا بھی گرتا تو اُسے نہیں دینا چاہئے تھا کیونکہ مفت میں موت کا منظر سامنے آ گیا تھا۔ ثانیہ آگے چلی جا رہی تھی جب اُس نے مُڑ کے دیکھا تو میں کافی پیچھے رہ گیا تھا اس لیے اُس نے سبب پوچھا تو بتانے پہ وہ خوب ہنسی۔

میں بولا ''اچھا تو مجھ پہ ہنس رہی ہو''۔

وہ ہنستی رہی اور بولی ''ہاں تو کیا کروں''۔

میں نے خبردار کرتے ہوئے کہا ''سوچ لو پھر کِس کر دونگا''۔

کہنے لگی ''جب پھر ہاتھ آؤں تب کرے گا نہ۔ ہاہاہا''۔ اور پھر ہنسنے لگی۔

میں بھی مسکرایا اور ہم اُس دکان میں گئے۔ اُس نے کپڑے لیے اور کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ ہم پردے میں بیٹھے ہوئے تھے اس لیے وہ مجھ سے دور بیٹھ گئی کہ کہیں میں پھر سے ویسا نہ کروں۔ ثانیہ کے سکول کی چھٹی ۱.۳۰ کو ہوتی تھی ہمیں اُس سے پہلے پہنچنا تھا اس لیے ہم واپس آنے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھے۔ اُس کو پتہ تھا کہ گاڑی میں، میں کچھ نہیں کہ سکتا اس لیے قریب ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھ پہ پیار جتا رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ اُس کے گرد گھما کر اُسے اور بھی قریب کر لیا۔ تقریباً ۱.۱۵ کو ہم وہاں پہنچے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اجازت لی اور گھر جانے لگا۔ وہ چھٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ بس آئی اور وہ بیٹھ گئی۔ جلال نے شکر کیا کہ ہم وقت پہ لوٹ آئے ہیں۔ مگر جو قسمت میں ہوتا ہے اُس کا کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسا ہی ہمارے توقعات کے غیر مطابق ہی ہوا۔ ڈرائیور کو شک ہوا کہ صبح ثانیہ نہیں تھی اور جلال نے کہا تھا کہ وہ نہیں جا رہی تو اب کہاں سے آ گئی۔ میں خوش تھا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ کسی کو پتہ نہیں ہے گھر والے بھی بے خبر ہیں۔ میں خوش تھا کیونکہ ہم نے بہت وقت ساتھ گزارہ اور وہ خوش تھی۔ میں خوش تھا کہ میں نے اُسے کِس کیا۔ اسی خوشی خوشی میں رات گزری اور اگلے روز میں سکول چلا گیا۔ چھٹی پہ جلال نے کال کی۔

میں نے پوچھا ''یہ کیسا جادو کیا مجھے کال کیسے کیا''۔

جلال نے کہا ''وہ سب چھوڑو (جگہ کا نام بتا کر) مجھے وہاں جلدی آ کر ملو''۔

میں بولا ''میں ابھی ۵ منٹ میں آتا ہوں''۔

میں بہت خوش تھا کہ جلال نے ملنے کے لیے بُلایا ہے۔ میں رکشے میں بیٹھ کر وہاں چلا گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا کہ اچانک کسی نے زور سے کسی چیز سے میرے سر میں دے مارا

اور میں بے ہوش ہو گر پڑا۔

اُس رات جب میں ہوش میں آیا اور ایک اندھیرے کمرے میں اپنے آپ کو پایا تو بہت ڈر گیا۔ مجھے باندھا گیا تھا ایسا محسوس ہوا کہ قبر میں دفن ہوں، مگر میں تو زندہ ہوں؟ میں چِلایا کہ ''کوئی ہے؟''

تو کسی نے بلب جلا دیا۔ اُس روشنی نے میری آنکھوں کو بند ہونے پہ مجبور کیا۔ میں ہاتھ سے اپنے آنکھوں کو اس روشنی سے بچا نہیں پایا۔ جب وہ اس قابل ہوئی کہ اس روشنی میں دیکھ سکے تو کھول دئیں۔ پہلے ہی جھلک میں جلال نظر آیا، اُس کے ساتھ اُس کے ابو اور ثانیہ کے ابو تھے۔ جب کہ میرے دائیں وہ اصلی درندہ وہ پاگل تھا۔

میں چلایا کہ ''یہ کیا کر رہے ہو، کیوں مجھے باندھا ہوا ہے۔ میرے گھر والوں کو پتہ چل گیا تو کسی کو نہیں چھوڑ نگے''۔

مگر اُن میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ جلال نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو میرے ساتھ تھا نہ؟ میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اس نے سر نیچے کیا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور اُن کے خاندان کے کچھ اور افراد بھی آ گئے۔ ایک نے اُس پاگل کو ایک موٹی سی سوئی دی اور ایک نے آ کر میری قمیض پھاڑ دی۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر بے سود۔ ڈر کے مارے میرا گلہ سوکھ گیا تھا۔ میری نظریں جلال پہ جمی ہوئی تھی کہ اُس پاگل نے وہ سوئی میرے بائیں بازوں میں گھسا دی۔ میری اتنی زور کی چیخ نکلی کہ سارے سہم سے گئے۔

جلال کے ابو نے کہا ''ارے! اسے چُپ کراو میرے کان کے پردے پھٹ رہے ہیں''۔

تو ایک شخص نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ کر مجھے چُپ کرانے کی کوشش کی۔ اُس کی ایک اُنگلی میرے منہ میں آئی تو میں نے زور سے کاٹ دیا اور اتنا دبایا کہ خون نکل آیا یہ دیکھ کر پاگل نے زور کا ایک مُکا منہ پہ دے مارا جس سے میرا سر چکرانے لگا تھا کہ دوسرے نے بھی رکھ کے دے دی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

جلال چلایا ''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگوں نے کہا تھا صرف ڈرائیں گے۔ یہ تو سچ میں مار رہیں ہیں۔ (اپنے ابو سے مخاطب ہوئے) آپ نے کہا تھا کہ اگر میں اس کو بُلاؤں تو آپ لوگ اس کو ڈرا کر چھوڑ دیں گے اور ثانیہ کو بھی کچھ نہیں کہیں گے''۔

پاگل نے ہنستے ہوئے کہا ''تمہیں ہم بے وقوف لگ رہے ہیں اس پل کا تو مجھے انتظار تھا۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے''۔

جلال نے ابو سے کہا ''یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں نے آپ پہ بھروسہ کیا تھا''۔

وہ غصہ میں بولے ''بھروسہ تو تم نے ہمارا توڑا ہے۔ کیا ہم نے تمہیں ثانیہ کے ساتھ اس لیے بھیجا تھا کہ اُس کی لڑکوں کے ساتھ ملاقاتیں کراؤ۔ تم نے اُن کی مدد کی ہے اور ہمارے خاندان کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کہ میں نہیں ہونے دونگا چاہے مجھے تمہاری قربانی دینی پڑے''۔

اُس کے بعد جلال کچھ نہ بولا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شائد وہ افسوس کر رہا تھا کہ ''میں اِن دونوں کو کیوں ملایا، کیوں ان کا آپس میں رابطہ رکھا، اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو یہ دیکھنے کو نہ ملتا''۔

میں اُسے اور وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور ایسے لاچار کھڑا تھا کہ جیسے اُسے پھانسی کی سزا سُنائی ہو۔ میں اُس کی آنکھوں میں درد کو دیکھ کر اپنا درد بھول رہا تھا کہ ایک بار پھر وہ سوئی میرے بائیں بازوں میں گھسا دی گئی۔ میں بہت تڑپا، بہت چلایا، بہت رویا مگر اُس ظالم نے سوئی نکال کر دوسری جگہ گھسا دی۔ اسی طرح اور چار دفعہ سوئی میرے بازوں میں گھساتے رہے۔

اور ہر بار سوئی گھسانے کے ساتھ پاگل یہ کہتا تھا'' آج یا تڑپ تڑپ کے جان دے دے گا یا مجھے زبان دے کہ اُسے دل سے بھلا دیگا، مٹا دیگا اپنی یادوں سے، جُدا کر دیگا اپنی زندگی سے۔ بول ورنہ آج زندہ نہیں جائے گا''۔

مگر ہر بار دل سے اُس کا نام نکلتا، یادیں گہری ہوتیں اور رشتہ مضبوط ہوتا تھا۔

میری تڑپ پہ ترس کھانے والا کوئی نہ تھا، میرے چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا، نہ کوئی میرے آنسو پونچھنے والا۔ جلال بڑھا کے اُنہیں روکے مگر اُس کے ابو نے اُس کو روک کر مارنا شروع کیا۔ میں بے حال، ہاتھ خون سے بھرا، منہ پہ خون آیا ہوا تھا مگر ظلم بڑھتا گیا۔ اُدھر جلال کو باندھ دیا گیا اِدھر بار بار میرے بازوں میں سوئی گھسائی گئی۔ میری سانس رُک رہی تھی مگر موت کا فرشتہ نہیں آنے والا تھا۔ کیونکہ آج امتحان کا دن تھا اور اُس میں دو ہی باتیں ہوتی ہیں پاس یا فیل۔ مگر خدا امتحان اُس حد تک لاتا ہے جتنی طاقت دی ہوتی ہے۔ تو پھر

کیوں نہ آج اپنی طاقت بھی آزما لے۔ میرا بایاں ہاتھ سُن ہو چکا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ ہے ہی نہیں۔ دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ مجھ پہ ظلم ہو رہا ہے دکھ اس بات کا تھا کہ جلال بے گناہ تھا اور میری وجہ سے اتنی تکلیفیں برداشت کر رہا ہے۔ مگر یہ تو شروعات تھی، پلاس لایا گیا۔ میرے منہ سے وہ جملہ نکالنے کے لیے یہ لوگ آج کچھ بھی کرنے والے تھے۔ مجھے کچھ نہیں پتہ تھا کہ اس سے اب کیا کیا کرینگے۔ شروع میرے سینے سے کی اور میرا گوشت نوچنے لگے۔ میرے چیخوں سے مُردا بھی اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا مگر پتہ نہیں یہ لوگ مجھے کہاں لے کر آئے تھے جہاں میری اتنی چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ پاگل ہر بار نوچنے کے ساتھ وہی جملہ دہراتا۔

ثانیہ کے ابو کو شائد رحم آ گیا یا شائد وہ انجام سے ڈر گئے تھے کہنے لگے ''بس کرو مر جائے گا۔ کیوں اپنے لیے دشمنی کے بیج بو رہے ہو''۔

پاگل کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا ''اس وقت میں کسی کی سننے والا نہیں ہوں خبردار جو اس کے حق میں کچھ کہا تو''۔

ثانیہ کے ابو اپنے بڑے بھائی سے مخاطب ہوئے ''کچھ خدا کا خوف بھی کرو۔ اپنے بیٹے پہ تو رحم کرو''۔

ثانیہ کے تایا نے غراتے ہوئے جواب دیا ''وکالت چھوڑ دو۔ پانی سر سے اُوپر ہو گیا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا اور جلال کا بھی بندوبست کیا ہوا ہے''۔

اپنے آپ کو بے بس پا کر کہنے لگے ''جو مرضی کرو مجھ سے تو اور برداشت نہیں ہو رہا میں تو چلا''۔

جلال مسکرا رہا تھا اُسے پتہ تھا کہ آج یہ لوگ کسی کے سننے والے نہیں ہیں۔

اُس کے ابو نے پاگل سے کہا ''لگتا ہے یہ ایسے نہیں بولے گا کچھ اور کرو''۔

پاگل نے سوئی لی اور میرے سینے پہ دل کی طرف زور سے مارا اور کہا ''اِسی دل میں ہے نہ وہ۔ تم نکالتے ہو کہ میں پورا دل نکال کے پھینک دوں''۔

میں اُسے اتنا بول پایا ''آج زور تم اپنی دکھاؤ اُسے بھلانے کے لیے اور میں اپنی دکھاتا ہوں اُسے ہمیشہ کے لیے دل میں رکھنے کی''۔

اُس نے یہ سُن کر اپنے مظالم میں اضافہ کر دیا۔ ایک شخص گوشت نوچتا تو دوسرا سوئی سے میرے جسم کو چھلنی کر رہا تھا۔ میری حالت دیکھنے کی نہیں تھی، میرا گلہ چلاتے چلاتے دُکھ گیا تھا، آواز خراب ہو گئی تھی۔ جلال تڑپ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ میرے لیے بولا ''خدا کا خوف کرو۔ اس بے چارے نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے سزا دینی ہے تو مجھے دو میں ہوں قصوروار''۔

میں کراہتے ہوئے بولا ''یہ جھوٹ بول رہا ہے ہر چیز کا ذمہ دار میں ہوں کسی اور کو کچھ مت کہنا''۔

پاگل حیران کھڑا تھا کچھ سوچ کہ بولا ''یہ بات مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ ان میں ہر کوئی یہ کیوں کہتا ہے کہ سارا قصور اُس کا ہے۔ اب اِن کے ساتھ کیا کیا جائے''۔

جلال ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''اِسے کہتے ہیں سچی دوستی۔ مگر تم لوگ تو اوروں کو دیکھانے کے لیے ہر معاملہ انا کا بنا دیتے ہو۔ میں آگ دیکھ رہا ہوں تم لوگوں کے گرد''۔

اُس کے ابو اُسے مارتے ہوئے بولا ''حرام خور تم میرا بیٹا ہو کر میرے خلاف بول رہے ہو۔ میں ابھی آتا ہوں پھر بولنا''۔ یہ کہ کر وہ چلا گیا۔

جلال نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ''ڈرو مت دوست میں تمہارے ساتھ ہوں بس تم ہار نہیں مانو۔ اِنہیں آخر اپنے گھٹنے ٹھیکنے ہونگے''۔

مجھ میں اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اُسے جواب دیتا مگر وہ میرا جواب سمجھ گیا تھا۔ جب پچھلے اوزاروں سے کام نہیں بنا تو ایک موٹی لکڑی اُٹھائی اور میرے ٹانگوں پہ مارنا شروع کیا۔ شائد درد کا بھی مجھ پہ رحم آیا کیونکہ وہ مارتے گئے اور میں نہ چلایا نہ رویا۔ یا شائد اور درد اتنا تھا کہ اُس میں اس مار کا درد پھیکا پڑ گیا ہو۔ یا شائد اس لیے نہ رویا ہو کہ اس درد کے لیے آنسو ہی نہ رہے ہو۔ جب وہ کافی مار چکے اور یہ جان گئے کہ اس مار کا مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اُنہوں نے میرے نبز کی جانچ کی کہ زندہ ہے کہ مر گیا ہے۔ جب زندہ پایا تو کچھ دیر چھوڑنے کا سوچا اور جلال کے ابو کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ میرا بہت خون بہہ چکا تھا میری بینائی کمزور ہو گئی تھی، سانس آ ٹک رہی تھی، دل نے دھڑکنیں مدھم کر دی تھیں۔

جلال ویسے ہی چلاتا رہا کہ ''خدا کے لیے اُسے چھوڑ دو، اُسے چھوڑ دو''۔

اگر خدا کو ماننے والا ہوتا تو ہمیں اتنے ظلم کے بعد تو چھوڑ دیتے مگر یہاں مجھے کوئی ایسا دیکھائی نہ دیا۔ جلال کے ابو نے دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھولا گیا وہ ہاتھ میں ایک انجیکشن لے کر آیا۔

پیچھے ثانیہ کے ابو آئے اور اُسے روکتے ہوئے کہا ''یہ غلطی مت کرنا۔ تباہ ہو جائے، برباد ہو جاؤ گے''۔

جلال کے ابو نے غصے میں کہا ''ایک انجیکشن تمہاری بیٹی کو بھی لگنا چاہے۔ مگر میں نے سوچا کہ اگر ذریعہ ختم کر دوں تو نہ رہی گی بانس نہ بجے گئی بانسری''۔

ثانیہ کے ابو نے کہا ''پچھتاؤ گے پل پل پچھتاؤ گے''۔

احساس ہوا کہ یہ لوگ جلال کے ساتھ کچھ کرنے والے ہیں۔ میں نے جلال کی طرف دیکھا تو وہ مطمئن تھا شائد اُسے پتہ تھا جو اُس کے ساتھ ہونے والا تھا اور مجھے تسلی دینے کے لیے وہ آنکھوں اور سر کے اشارے کا سہارا لے رہا تھا۔ ثانیہ کے ابو اپنے بھائی کی منت سماجت کر رہا تھا کہ ایسا نہ کرو مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور جلال کے گردن میں وہ انجیکشن گُھسا دی۔ جلال کی ایک ہلکی سی آہ نکلی اور اُس بے درد نے انجیکشن خالی کر دی۔ جلال کی اُس چھوٹی سی آہ میں جتنا درد چُھپا ہوا تھا وہ میرے ہر ایک چیخ و پکار سے زیادہ تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ اُسے زہر کا انجیکشن لگایا گیا ہے۔ مجھ میں جتنی طاقت تھی میں نے سب لگا دی کہ اپنے آپ کو چھڑا لوں اور جلال کے پاس جاؤں مگر سب بے سود۔ اور ایک ہی پل میں اس کی آنکھیں بند ہو گئی، سر نادم ہو کر لٹک گیا اور اُس کے جسم سے روح نکل گئی۔ اُس رات کی میری آخری چیخ جلال کے نام کی تھی۔ میرے سامنے اُس کی جان لے لی گئی، اُس بے گناہ کو میرے گناہوں کی سزا دی گئی۔ میری آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں، میرا دماغ غلط سوچ رہا ہے، میرے احساسات غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہو ہی سکتا۔ میں کچھ ایسی باتیں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا اور اپنی آنکھیں بند کر دی۔ مگر حقیقت آنکھیں بند کرنے سے بدل نہیں جاتی۔ میرا جسم پہلے درد سے سُن ہو گیا تھا اور دل و دماغ جلال کی لاش کو دیکھ کہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ثانیہ کے ابو اپنا سر پکڑ کر آنکھوں میں آنسو لیے ایک طرف بیٹھ گئے۔

جلال کے ابو، جلال کو کچھ دیر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

پھر میری طرف مُڑ گیا اور پاگل کو کہا ''اِس کا قصہ بھی جلدی ختم کر دو''۔

اور کتنا درد یہ لوگ مجھے دیتے۔ جتنی دے چکے تھے اور جتنی دینے والے تھے اُن میں سب سے زیادہ دردناک جلال کی جُدائی تھی۔ جو مجھ سے چھین سکتے تھے چھین چکے تھے۔ مگر وہ اپنی کوشش میں مگن رہے۔ پلاس اُٹھایا گیا اور میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن پکڑ لیا۔ جس سے سردی سی سرسراہٹ کی لہر میرے جسم میں دوڑ پڑی اور وہ کھینچنے لگا۔ درد کی شدت سے آنکھیں باہر نکل گئی تھی دانتوں کو اتنے زور سے دبایا تھا کہ لگا ابھی ٹوٹ جائیں گے۔ ناخن نکل گیا اور میری زرہ سی جو سکت تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

صبح جلال سکول میں ملا۔ میں بہت خوش ہوا کہ جلال زندہ ہے اور دوڑ کے اُسے گلے لگ گیا۔

جلال نے مجھے کہا ''میں نے کہا تھا نہ کہ محبت نہ کر یہ میری جان لے گا''۔

میں نے کہا ''اب میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دونگا''۔

وہ بے چینی سے بولا ''نہیں اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم جہاں بھی ملنے آؤ گے وہ لوگ ہمارے پیچھے ضرور آئنگے''۔

اُس کے کہنے کے ساتھ ہی کچھ لوگ آئے اور اُنہوں نے جلال کو پکڑ لیا۔ جلال اطمینان سے کھڑا رہا۔ میں نے اُسے چھڑانے کی کوشش کی تو اور لوگ آ گئے اور مجھے بھی پکڑ لیا۔ وہ اتنے طاقتور تھے کہ مجھے ملنے تک نہ دیا۔ ایک شخص انجیکشن نکال کے اسی طرح جلال کے گردن میں دے ماری اور جلال زمین پہ گر گیا اور اُسی طرح میری چیخ نکلی کہ میں ہوش میں آ گیا۔

میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ جسم پورا پٹیوں سے بھرا ہوا تھا بایاں ہاتھ جیسے کاٹا ہو محسوس ہو رہا تھا کہ نہیں ہے۔ دونوں ٹانگوں پہ بھی پٹی بندھی ہوئی تھی، ملنے سے بھی رہی تھی اور ہر زخم سے کرنٹ سی میرے دماغ کی طرف آ رہی تھی۔ پاس پھوپھی بیٹھی ہوئی تھی جس نے رو رو کہ اپنا بُرا حال کیا ہوا تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر خوشی سے جلدی باہر دوڑ کے گئی اور باہر بیٹھے گھر والوں کو بُلا کہ لے آئی۔ بہنیں لپٹ لپٹ کر خوشی سے رونے لگ گئی۔

چچی مجھے دیکھ کر اپنے آپ کو رونے سے روک نہ پائی اور تیز آواز میں رو کہ پھوپھی سے لپٹ پڑی۔ جب تھوڑی سنھبل گئی تو کہا ''بیٹے یہ کیا حال بنایا ہوا ہے اپنا۔ تمہارا حال دیکھ کر سب کا بُرا حال ہے ہر کوئی رو رہا ہے ہر کوئی پریشان ہے، ہمیں لگا تم ہوش میں آ نہیں آ سکو گے۔ کسی نے بھی تین دن سے کچھ نہیں کھایا''۔

میرے سر پہ وہ شفقت بھرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جس سے مجھے خوب راحت ملی۔ شہزاد بھی آیا اور میرے بیڈ کے سامنے کھڑا ہوا اور اُس کے آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ میرے لے پریشان تھا، میرے لیے خفہ تھا۔ گھر فون ہوا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں تو کچھ ہی دیر میں میرے وارڈ میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ جن میں سے دو بندے غائب تھے، میرے ابو اور تایا۔ جب بھی میں درد سے کراہتا تو مجھے پین کیلر دے کر میرے درد کو کم کرنے کی کوشش کرتے مگر جو آگ و درد اندر تھا وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے اس کے کم ہونے کے لیے کوئی بندوبست نہیں تھا۔ تقریباً دو ہفتے ہسپتال میں رہا ہر کوئی آیا سوائے اُن دو کے۔ کچھ لوگ مستقل میرے ساتھ رہے مگر کسی نے ان دو ہفتوں میں میری آواز نہیں سنی تھی۔ جب حالت بہتر ہونے لگی تھی اور زخم بھرنے لگے تو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ہفتہ دو گھر میں بھی پڑا رہا۔ تب جا کر میری صحت معمول پہ آنے لگی تھی۔

میرے سارنے زخم بھر چکے تھے مگر دل کے زخم ابھی بھی تازہ تھے۔ میرے صحت یابی پہ کچھ لوگوں کے سوا سب خوش تھے۔

شاید ابو نے غصہ سے میری الماری توڑ دی تھی اور اُس میں میرا جتنا سامان تھا جلا دیا تھا جس میں ثانیہ کے سارے خطوط اور اُس کی اور جلال کی کچھ تصاویر تھے۔ میں نے جب یہ سب دیکھا تو بہت رویا کہ اُنہیں تو جُدا کر لیا اب اُن کی یادیں بھی مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ تھے جنہیں اپنی اولاد کی خوشی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ جلال کی جُدائی نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ کیا اُنہیں رحم نہیں آیا جلال کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے اُن کا ہاتھ نہیں کھانپا، اُنہیں خدا کا خوف نہیں آیا۔ ایسے انسانوں کے لیے کیسی سزا منتخب کی جائے؟

اس تھوڑے سے عرصے میں، میں نے کچھ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی اور کچھ دلوں سے اپنی جگہ مٹا دی تھی جیسے کہ ابو اور تایا۔ وہ میری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے یہ طے کیا تھا کہ مجھے ہاسٹل بھیج دیا جائے۔

مسعود بھائی میرے پاس آئے اور کہا ''یاد ہے نہ میں نے کہا تھا کہ اپنے آپ کو سُدھار لو آئندہ میں خود گھر سے نکال دونگا''۔

میں بس سر جھکائے ہوئے سن رہا تھا۔

وہ کہتے رہے ''جو لوگ اپنے اولاد کو قتل کر سکتے ہیں وہ تمہیں بھی مار سکتے ہیں''۔

مجھے جلال اور ثانیہ یاد آئے (''جب وہ دونوں پہلی بار گاڑی میں آئے تھے۔

پھر جب میں اور ثانیہ گلے ملے تھے۔

جب ثانیہ مجھ سے کچھ کہے بنا لپٹ پڑی۔ میں نے اپنے باہوں میں ساری دنیا سمیٹ لی تھی۔

اور جب جلال نے مجھے کہا کہ مجھے خطوط لانے اور لے جانے کے لیے تنخواہ چاہیئے۔

میں نے اُس پہ آنکھیں نکالتے ہوئے کہا ''کمینے اب مجھ سے پیسے مانگے گا''۔

اُس نے کہا ''تو ٹھیک ہے میں پھر کوئی خط نہ اُسے دونگا نہ اُس سے لونگا''۔

میں نے اُسے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر کہا ''تم تو میری جان ہو۔ یار تمہیں کیا پتہ ثانیہ اور تو میرے زندگی کے انمول تحفے ہو''۔

اُس نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ''تم بڑے چالو چیز ہو ایموشنل بلیک میل کرتے ہو''۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تم تو بڑے سمجھدار بن گئے ہو یار''۔ وہ بھی اس بات پہ ہنس پڑا۔

پھر جب ہمیں پشاور جانے کے لیے گاڑی میں بٹھایا۔ اور جب میں جلال سے گلے ملا جس کا موقع بہت عرصے بعد ملا۔

میں آنکھوں میں آنسو لیے کہا ''میں بڑا بدقسمت ہوں کہ تم دونوں سے ایک ساتھ جدا ہوا۔ میں ہر چیز بھول جاؤ نگا لیکن تیرے احسان کبھی نہیں بھول سکتا''۔

جلال نے اطمنان سے کہا ''میں نے احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض نبایا ہے''۔

جلال ''تم سے دور ہونے سے تیری دوستی کی قیمت اور بھی بڑھ گئی''۔

میں نے کہا ''دوستی میں نے نہیں بلکہ تم نے نبھائی ہے اور میری زندگی میں تم جیسا اور کوئی دوست نہیں آ سکتا۔ (میں مسکرا کہ بولا) اچھا چلتا ہوں وقت زیادہ نہیں ہے۔ خدا خافظ''۔

اُس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے کہنے لگا ''خیال سے جانا''۔

آخر میں اُس کے وہ آخری لمحات میرے نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔

جلال نے ابو سے کہا ''آپ نے کہا تھا کہ اگر میں اس کو بُلاؤں تو آپ لوگ اس کو ڈرا کر چھوڑ دیں گے اور ثانیہ کو بھی کچھ نہیں کہیں گے''۔

''یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں نے آپ پہ بھروسہ کیا تھا''۔

''خدا کا خوف کرو۔ اس بے چارے نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے سزا دینا ہے تو مجھے دو میں ہوں قصوروار''۔

''اِسے کہتے ہیں سچی دوستی۔ مگر تم لوگ تو اوروں کو دکھانے کے لیے ہر معاملہ انا کا بنا دیتے ہو۔ میں آگ دیکھ رہا ہوں تم لوگوں کے گرد''۔

''ڈرومت دوست میں تمہارے ساتھ ہوں بس تم ہار نہیں مانو۔ اِنہیں آخر اپنے گھٹنے ٹھیکنے ہونگے''۔

پھر جلال کے ابو نے اُس کے گردن میں وہ انجیکشن گُھسا دی۔ اُس کی ایک ہلکی سی آہ نکلی اور اُس بے درد نے انجیکشن خالی کر دی۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا۔''

میرے آنکھیں آنسوں سے بھر گئے۔ جلال نے اپنی دوستی نبھائی اور ثانیہ نے اپنے محبت کا حق ادا کیا تھی کہ جلال نے اپنی جان تک پیش کی۔ میرے آنکھوں میں آنسو آئے تھے مگر بھائی سمجھ نہ پائے کیونکہ ایسی باتیں وہ سمجھ سکتا ہے جو آنکھوں میں لکھی بات پڑھ سکتا ہو، دل کی بات سمجھ سکتا ہو۔ اس لیے وہ اپنی بات کرتا رہا۔

وہ کہنے لگے ''تم نے۔۔۔تم نے ہم سب کا دل توڑا ہے''۔

میں نے کہا ''سچ میں، میں نے سب کا دل توڑا ہے مگر پھر بھی مجھے سب کی فکر ہے لیکن میرا دل کتنی بار، کتنے لوگوں نے، کتنی بے دردی سے توڑا کیا کسی کو احساس بھی ہے۔ مجھے وہ لوگ پوری رات مارتے رہے کیا کسی نے میرے لیے اُن سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا یا کیا میں صرف اس لیے ہوں کہ سب لوگوں کا کیچڑ مجھ پہ اُچھالا جائے اور ہر کوئی آکر اپنا غصہ مجھ پہ اُتارتا چلا جائے۔ اگر یہی میری اوقات ہے تو آپ لوگ مجھے کیا گھر سے نکالیں گے میں خود جانے کیلئے تیار ہوں''۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کچھ سوچتے رہے اور پھر بولے ''مجھے افسوس ہے جو ہوا، میں تمہارے خلاف نہیں بس تمہارا انداز غلط تھا۔ تم نے اتنے بڑے قدم بغیر بتائے اُٹھا لئے۔ اُن کی خبر تو ہم لے چکے ہیں اور اُنہیں اپنی غلطی کا احساس دلا دیا ہے مگر یہ فیصلہ بھی ہو چکا ہے کہ تم بورڈنگ سکول جا رہے ہو''۔ وہ یہ کہ کر کمرے سے چلے گئے۔

اگلے دن شہزاد سے پوچھنے پہ پتہ چلا کہ اُن کے گھر کے ایک بندے کو پکڑ کے لائے تھے اور میری طرح اُسے رات بھر باندھ کر رکھا اور خوب مارا بھی۔ اسی بات پہ دونوں خاندانوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے اور اب مجھے اگر کہیں اکیلے دیکھ لیتے تو بدلہ لینے کی کوشش کرتے۔ اس لیے مجھے ہاسٹل بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں تھا کیونکہ میں اُس سے اور بھی دور ہو جاتا مگر گھر والوں کو میری فکر تھی۔

میرے ظاہری زخم بھر چکے تھے لیکن نشانات زندگی بھر کے لیے رہ گئے۔ اگر میں اس بار کوئی غلطی کرتا تو ابو کا صبر تمام ہو جاتا۔ تو نہ میری گھر میں کوئی جگہ ہوتی نہ دنیا میں۔ مگر ان چیزوں کی پرواہ کس کو تھی۔ یہ عشق چیز ہی ایسی ہے نہ اس میں جان کی پرواہ ہوتی ہے نہ جہاں کی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ہاسٹل جانے سے پہلے ایک بار پھر ملاقات ہو یا کم از کم فون پہ بات ہو۔ مجھے کہا گیا تھا کہ پیر کے دن شیراز کے ساتھ جانا ہے۔ مجھے تھوڑا وقت مل گیا تھا۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا کہ جس پہ وہ لوگ شک بھی نہ کرے اور میں اس پہ بھروسہ بھی کر سکوں۔ یہ بات ناممکن سی تھی مگر ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اس کام کے لیے ایک ہی انسان بالکل صحیح تھا اور وہ تھا احتشام، جس کی کزن ثانیہ کی گاڑی میں جاتی تھی۔ ایک دن میں اُسے منانے گیا۔

احتشام ''میں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو پاگلوں کا علاج اچھی طرح کرتا ہے، اس سے تمہاری بات بھی کرتا ہوں''۔

میں نے خیرت سے کہا ''تمہارا مطلب کیا ہے''۔

اُس نے جواب دیا ''یہی کہ تم اپنے لیے تو قبر کھود رہے ہو ساتھ میں میری بھی کھود لوگے''۔

میں بولا ''کیوں یار کونسا میں تمہیں اُسے اُٹھا کر لانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں موبائل دونگا تم اپنے کزن کو دینا وہ اُسے دے دیں گی۔ بات ختم''۔

وہ نہیں مان رہا تھا ''نہ یار نہ اگر اُس کے ساتھ موبائل پکڑا گیا تو میرا نام ضرور آئے گا۔ میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا''۔

میں نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی ''ایسا کچھ نہیں ہوگا میں اُسے سمجھا دونگا کہ کسی کا نام بیچ میں نہ آئے''۔

مگر وہ نہیں مانا ''معاف کر دو یار میں ایسا نہیں کر سکتا''۔

مجھے اُس پہ بہت غصہ آیا ''اچھا ہے، بہت اچھا ہے زندگی بھر اپنی شکل مت دکھانا کیونکہ بزدل اور ڈرپوک نامرد ہوتے ہیں اور نامردوں کی شکل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا''

یہ کہ کر میں روانہ ہوا کہ اُس نے آواز لگائی ''ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔ میں کزن سے بھی بات کرتا ہوں''۔

میں بہت خوش ہوا مگر بنا پلٹے چلا گیا۔ موبائل کا انتظام کر لیا بس احتشام کے سکول سے آنے کی دیر تھی۔ میں موبائل اُس کو دیتا اور اُس کے کزن کے ذریعے ثانیہ تک پہنچ جاتا۔

چھٹی کا وقت قریب تھا کہ بہن آئی اور کہا ''نہالو، کپڑے بدل لو، تیار ہو جاوٴ۔ شیراز بھی تیار ہو رہا ہے''۔

میں نے پوچھا کہ ''کس لیے''۔

اُس نے کہا ''تمہیں نہیں بتایا کسی نے؟ بھائی نے کہا ہے کہ آج ہی ایبٹ آباد چلے آوٴ''۔

میں نے وقت دیکھا تو چھٹی میں ابھی وقت تھا اور پھر گاوٴں پہنچنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ میں کس کی منتیں کرتا کہ آج جانے کا یہ پروگرام ختم کر دے۔ ابو اور تایا کا تو ابھی تک سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ تو اُن سے بات کیسے کرتا اور باقی لوگوں کے پاس یہ اختیار نہیں تھا۔ میں پریشان کمرے میں کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف پھر رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ کچھ دیر بعد بہن دوبارہ آئی اور کہا ''تم ابھی تک نہانے نہیں گئے جلدی کرو وہ آنے والا ہے اور اگر نہانا نہیں ہے تو کپڑے بدل کر تیار ہو جاوٴ''۔

یہ کہ کر وہ پھر چلی گئی۔ مجھے غصہ آیا ہوا تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میں بھاگ کے بازار گیا کہ شائد وہ آ جائے۔ وہ تو نہیں آئے مگر مجھے گھر بُلانے کے لیے ایک بچہ ضرور آیا۔ مجبوراً مجھے گھر آنا پڑا اور اُن کے آنے سے پہلے ہم ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔ پورے راستے میں بے قرار ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا پتہ نہیں میں کب تک وہاں رہوں اور اُس کی جُدائی میں تڑپتا رہونگا۔ اتنے وقت میں اُس کا کیا ہوگا یہی کچھ خیالات تھے جو میرے ذہن میں پورے راستے رہے اور مجھے اندر ہی اندر کھاتے رہے۔

شام کو ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ یہاں اردگرد پہاڑوں کا یہ منظر بہت حسین لگا۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار ایسے حسین جگہ آیا تھا۔ بادل کے ٹکڑے آوارہ گھوم رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور جس کی وجہ سے دکانوں پہ اتنا رش تھا کہ جیسے سارا شہر گھروں سے نکل کر بازار آیا ہو۔ یہ میرا ایبٹ آباد کے سرزمین پہ پہلا قدم تھا۔ منڈیاں میں میزائل چوک کے پاس Daewoo کے آڈے پہ اُترے۔ ہمیں مانسہرہ جانا تھا اس لیے وہاں جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھے۔ پہاڑ پہ بنے ہوئے گھروں میں لگے ہوئے بلب ایسے لگ رہے تھے جیسے آسمان میں چمکتے ستارے۔ میں یہاں کی خوبصورتی سے کافی متاثر ہوا مگر اُس سے لطف اندوز ہونے کے لیے مجھے اپنے خیالوں سے فُرست نہیں تھی۔ مانسہرہ میں مسعود بھائی ہمیں لینے کے لیے کھڑے تھے۔ وہ ہمیں ساجد بھائی (مسعود بھائی کے دوست) کے گھر لے گئے۔ وہاں رات کا کھانا کھایا، رات بھی وہی پہ گزاری۔ اگلے دن ساجد بھائی ہمیں ایک سکول لے جانے لگے۔ ویسے تو مئی کے مہینے میں کافی گرمی ہوتی ہے مگر یہاں موسم خوشگوار تھا بادل آئے ہوئے تھے اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ساجد بھائی مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ پہلے وہ ہمیں صدر لے کر گئے اُن کا کچھ کام تھا۔

جاتے ہوئے ہم ایک جگہ سے گزرنے لگے تو مسعود بھائی نے اشارہ کر کے بتایا ''کہ یہ ایوب میڈیکل کمپلیکس ہے۔ یہ ایشیاء میں سب سے بڑا ہے۔ باہر ممالک سے لوگ یہاں پڑھنے کے لیے آتے ہیں''۔

شیراز نے بیچ میں ٹانگ لڑا کر کہا ''کوشش کرو کہ یہاں آسکو''۔

خود تو جیسے بڑے تیر مارے ہوں۔ میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس کو کہتے ہیں۔ کاش اتنی انگلش تو سیکھ لی ہوتی۔ یہ کمپلیکس واقعی کافی لمبا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کس نے بنایا ہوگا اور کتنے سال لگے ہونگے اس کو بنانے میں۔ واپسی پہ اُسی کمپلیکس کے آگے سے گزرے تو ہم داہنے طرف ایک شاندار عمارت جو تین منزلا تھی اور چوتھی منزل بن رہی تھی اُس کی طرف موڑے۔ اُس پہ بورڈ لگا تھا جس پہ لکھا ہوا تھا ماڈرن سکول سسٹم۔ بس میری قسمت میں تو یہی سکول لکھا تھا اور یہاں سے میرے نئی زندگی کی شروعات ہونے والی تھی۔

اندر جاتے ہوئے ایک چیز بہت عجیب لگی وہ یہ کہ اتنے بڑے سکول کا مین گیٹ نہیں تھا اور راستہ پکا ہونے کے بجائے پتھریلا تھا۔ اندر گئے تو دیکھا کے ایک طرف چھوٹی سی عمارت تھی جو ایک قسم کا بھوت بنگلا نظر آرہا تھا۔ کیا یہاں سرکس بھی لگتا ہے یا نہ پڑھنے والے بچوں کو یہاں ڈرایا جاتا ہے؟۔ ساجد بھائی نے گاڑی اُسی بھوت بنگلے کے ساتھ کھڑی کی۔ اگر اُنہیں شک تھا کہ میں ڈرتا نہیں ہوں اور مجھے چیک کرنا چاہتے ہیں تو میں خود بتا دیتا ہوں کہ میں بہت ڈرپوک ہوں اور گیدڑ کی طرح اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہوں۔

شیراز نے سکول کے عمارت کو دیکھ کر کہا ''واہ کتنا شاندار سکول ہے۔ اگر اس سکول میں داخلا مل گیا تو لائف بن جائیگی''۔

ایسے کہ رہا تھا کہ جیسے یہاں رہ کے گیا ہو۔

بھائی نے کہا ''اس کے عمارت سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی معمولی سکول نہیں ہے''۔

یہ کیا یہ لوگ تو ماحول کے جانچ کے لیے آئے تھے مگر عمارت کی خوبصورتی دیکھ کر دھوکے میں پڑ گئے۔ مجھے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ کیونکہ ایک کہاوت ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی

بھائی بولے ''شکر کرو وہاں کے فضول سکولوں سے جان چھوٹ گئی۔ ابو فخر کرینگے کہ میرا بیٹا ایسے سکول میں پڑھتا ہے''۔

شیراز ویسے ہی بیچ میں بولا ''وہاں تو پڑھتے نہیں تھے مگر یہاں دل لگا کہ پڑھنا''۔

بھائی کہنے لگے ''ہاں نہ ابو تم پہ اتنا خرچ کر رہے ہیں۔ تو تمہیں اُن کو خوش کرنے کے لیے پڑھنا پڑے گا''۔

کیا یہاں پہ میرا ٹسٹ ہونے والا تھا اگر ایسا تھا تو میں پہلے سے ہار مان لیتا ہوں۔ سب مجھے دھلاسے دینے لگے کہ ٹسٹ ہو یا انٹرویو ہوڈرنا مت کانفڈنٹس سے جواب دینا، جھجک محسوس نہ کرو، اُسے امپرس کرنے کی کوشش کرو۔

''اگر اتنا سب کچھ آتا ہے تو تم لوگ خود کیوں نہیں دیتے''۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

مجھے عجیب محسوس ہو رہا تھا شائد اس لیے کے مجھے ڈر لگ رہا تھا کیوں کہ کبھی ٹیسٹ یا انٹرویو نہیں دی تھی یا شائد اس لیے کے نئی جگہ تھی۔ اندر جاتے ہی پتہ چلا کہ یہ تو ہوٹل ہے۔ وہی ہوٹل والا انداز ویسے ریسپشن مگر میرا اندازہ غلط نکلا کیوں کہ یہ تھا تو سکول ہی مگر ہوٹل کے نقشے پر۔ جو کہ اس سکول کے ایم۔ڈی نے قطر سے چُرا کے لایا تھا۔ رسپشن پہ کھڑے ایک آدمی سے پتہ چلا کے رٹن ٹیسٹ ہوگا۔ ہر ادارے والوں کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو شکل سے پہچان لیتے ہیں۔ مگر ان میں اتنی صلاحیت ہوتی کہ شکل دیکھ کر انداز لگا سکتے تو شائد مجھے ٹیسٹ کے لیے نہ بیٹھنے دیتے۔ تو پھر اُن کو ایسا ادارہ چلانے کا بھی حق نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا فیل ہونے کا کیوں کے نہ مجھے کچھ آتا تھا نہ کچھ پڑھ کے آیا تھا۔ مجھے پرچے دے کر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ جو چھ پرچے ہم چھ دن میں دیا کرتے تھے وہ آج ایک گھنٹے میں دینے تھے۔ Maths میں میں بہت اچھا تھا مگر کبھی پڑھی نہیں تھی۔ Bio کے ٹیچر سے بہت مار کھائی مگر کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ Phy کسی نے اچھی طرح پڑھائی نہیں۔ Che مجھے بُری لگتی تھی۔ Urdu میں تو سب پٹھان کمزور ہوتے ہیں۔ رہی بات Eng کی تو کیا میں انگریز کا بیٹا تھا۔ سارے M.D کے افس میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ اور میں کسی معجزے کا انتظار کر رہا تھا کہ ٹسٹ پاس کرلو۔

مجھے پتہ تھا کہ میری بُری طرح بے عزتی ہونے والی ہے۔ جو کہ روز ہوتی ہے مگر آج کچھ خاص قسم کی ہونے والی تھی۔ اس نئی جگہ بھی میری عزت کی واٹ لگنے والی تھی۔ سب پرچوں کو اُلٹ پلٹ کیا کہ کچھ تو ملے جو مجھے آتا ہو آخر میں Bio کے پرچے میں Definition of Biology پر نظر پڑی تو پٹ سے لکھ ڈالا کیوں کہ یہی صرف ٹھیک سے آتا تھا۔ اسی طرح تھوڑہ بہت کر کے سب میں کچھ نہ کچھ لکھ ڈالا۔ تسلی سے میں نے پرچے اُن کو دے دیئے۔ انہوں نے پرچے چیک کرنے کے لیے بھیج دیے۔

مجھے M.D کے افس میں بلایا گیا۔ جیسے ہی میں اندر گیا تو کیا دیکھتا ہو کہ ایک عجیب وغریب چیز پر نظر پڑی غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ کوئی چیز نہیں بلکہ کوئی انسان تھے یا صرف لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی پاگل یا کسی ریڑی چلانے والے کو پینٹ، شرٹ اور ٹائی پہنا کر زبردستی کرسی پہ بٹھایا ہو۔ بال ایسے کھڑے تھے جسے ابھی نیند سے اٹھا ہو یا جیسے کرنٹ لگا ہو۔ لڑکے اُسے کُتا کہ کر بُلاتے تھے جو کہ اُن کے پرسنیلٹی کے ساتھ میچ کرتا تھا۔ مجھے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔

میں بیٹھا تو پوچھنے لگے کہ: ''بیٹا ٹیسٹ کیسے کیا''۔

میں نے اطمینان سے جواب دیا: ''اچھا سر''۔

'سر' لفظ کیسے میرے منہ سے نکلا مجھے خود حیرانی ہو رہی تھی۔ سر اس کو کہتے ہیں جو اس کے کہنے کے قابل ہو۔ مگر میں نے غلطی کی۔

انہوں نے مسکرا کر کہا: ''وہ تو ابھی پتہ چل جائے گا''۔

ایسا لگا کہ مسعود بھائی نے سب کچھ بتا دیا ہو اور اس عجیب وغریب شخص کے سامنے بھی میری عزت جو نہیں تھی اُس کا خیال نہ رکھا ہو۔ جو وہ کبھی نہیں رکھتے۔ مسعود بھائی نے جب کہا کہ ہاسٹل میں بھی رکھنا ہے تو تب ایم۔ڈی نے تو سوچا ہوگا کہ اب آیا اُونٹ پہاڑ کے نیچے۔

مسعود بھائی نے بھی پوچھا کہ ''کچھ لکھا ہے کہ خالی دے کر آئے ہو''۔

میں نے معصومیت چہرے پہ لاتے ہوئے کہا ''لکھا تو بہت کچھ ہے اب نمبر دینا ان کی مرضی''۔

ساجد بھائی مسکرائے اور کہا ''ٹھیک لکھا ہو تو نمبر دینگے''۔

شیراز کے ارشاد کا بھی انتظار تھا کہ وہ بھی اپنے دل کا بوجھ مجھ پہ ہلکا کر دے۔

شیراز طنزیہ انداز میں ''شکل سے تو ایسے لگ رہا ہے کہ ٹاپ کرے گا مگر افسوس کہ شکل پہ نمبر نہیں ملتے''۔

شائد میں نے منہ پہ کچھ زیادہ معصومیت لائی ہوئی تھی۔اس لیے میں نے اپنے آپ کو تھوڑا سنجیدہ کیا۔سب چائے پی چکے تھے مگر میرا حصہ سلامت تھا۔چائے کا کپ میرے سامنے رکھا گیا۔ہاتھ لگا کر دیکھا تو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔جو کہ میں نے ایک ہی گھونٹ میں پی لی۔سارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے تھے اس لیے میں نے خالی پیالی کو بار بار پینے کا ناٹک کیا۔تقریباً ۱۵ منٹ کے بعد ٹسٹ کا نتیجہ آ گیا۔یہ دنیا کا سب سے جلدی نکلنے والا نتیجہ تھا۔نتیجہ لانے والا کچھ عجیب عجیب لگ رہا تھا، کیونکہ اُس نے پینٹ اپنے سینے تک باندھی ہوئی تھی۔بال عجیب سے اور چھوٹی داڑھی تھی بالکل جنگلی لگ رہا تھا۔مجھے شک ہوا کے اُس نے کسی اور کی پینٹ پہنی ہے۔جس کا بھی تھا مجھے اس سے کوئی کام نہیں تھا.مجھے کام تھا تو صرف اپنے نتیجہ سے۔میں بے صبری سے انتظار کر رہا تھا کہ کب میرا نتیجہ سنائے اور کہے کہ نکلو تم یہاں رہنے کے قابل نہیں۔اور ہم چلے جائیں تا کہ میری جان چھوٹ جائے۔بے غزتی تو ویسے بھی ہونے والی تھی۔مگر یہاں سے جانا ضروری تھا۔

نتیجہ لانے والا بولا ''بیٹا آپ نے تو کچھ بھی ٹھیک نہیں لکھا اور بُری طرح فیل ہو۔Bio کی تعریف تک غلط لکھی ہے''۔

میں خوش ایک بات پہ ہوا تھا کہ چلو یہاں داخلہ نہیں ملے گا اور افسوس دو باتوں کی تھی ایک یہ کہ جو چیز مجھے صحیح آتی تھی وہی غلط نکلا اور دوسری یہ کہ اب تو میری بری طرح بے غزتی ہونے والی تھی۔یہ سن کر مسعود بھائی مجھے گھورنے لگے.ساجد بھائی اور شیراز حیران رہ گئے کہ یہ کیا شرم کو لائیں ہے کہ ایک آسان چیز بھی غلط کر دی۔

ساجد بھائی نے اپنا فرمان جاری کیا کہ:''واہ بھئی تم تو تیس مار خان نکلے۔باتیں نوابوں کے اور کام فقیروں کے''۔

ان کا یہ تنز بُرا لگا مگر کیا کرتا کام ہی ایسے کیا تھا۔

شیراز نے تنز بھرے انداز میں کہا ''تم نے ہمیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا''۔

منہ دیکھانے کے لائق تھا ہی کب، مجھے تو ویسے بہانا بنا رہا ہے۔بس یہ لوگ کہتے رہے اور میں چپ کر کے سنتا رہا۔

مسعود بھائی پھولوں کے ہار ڈالنے کے لیے تیار تھے مگر اس وقت کچھ نہ کہا۔شائد اُنہیں میری عزت کا تھوڑا خیال آیا ہوگا۔یا شائد کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ہم سب سمجھے کہ یہ لوگ اب ہمیں جانے کے لیے کہیں گے۔مگر کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ بھیکاریوں کی طرح بھیک سے خوش ہوتے ہیں۔بھائی نے فیس نکالی اور گننے لگے۔

ایم۔ڈی نے فوراً کہا ''خیر ہے ! بچہ ہے پڑھ کے نہیں آیا ہوگا۔اب اِدھر آ جائیگا تو پڑھے گا''۔

بھائی سمجھ گئے کہ کام ہو گیا۔

بھائی نے کہا ''تو یہ کب سے آ سکتا ہے''۔

وہ بولے ''جب سے یہ چاہے''۔

بھائی سوچ کر بولے ''تو ایسا کرتے ہیں کہ.........یہ پیر سے کلاس لینے آ جائے گا''۔

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ''جیسا آپ ٹھیک سمجھیں''۔

یہ سن کر سارے اٹھے اور اجازت لے کر آفس کے باہر آئے۔

میرا بھائی Relife International این۔جی۔او مانسہرہ میں تھے۔ساجد بھائی بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ہم وہاں گئے چائے پی۔مجھے گاؤں جانا تھا، ہاسٹل کی ضرورت کی چیزیں لینی تھی۔اس لیے میں اور شیراز اُسی شام گاؤں روانہ ہوئے۔میں بہت خوش تھا کہ سوچ سے بھی جلدی واپس جا رہا ہوں۔اس بار اس موقع کو ضائع نہیں کرونگا۔ہم شام کے چھ بجے نکلے۔بدقسمتی سے بہت بارش ہوئی اور ہوبلیاں کا پل پانی آنے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔جس کی وجہ سے ہم ایک گھنٹہ وہاں رُکے۔سوچے ہوئے وقت سے کافی لیٹ ہو گئے تھے، اور کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم گھر پہنچے۔تھکاوٹ کی وجہ سے اسی وقت سو گیا۔

گھر والے خوش تھے کہ مجھے اچھی جگہ داخلہ مل گیا۔سب میرے بہتر مستقبل کے لیے دُعا گو تھے اور یہ کہتے رہے کہ جو یہاں ہوا اُسے بھول جاؤ اور وہاں اچھے سے وقت گزارنا۔گھر والے مجھے وہ چیزیں بھولنے کے لیے کہ رہے تھے جس نے میرے زندگی پہ گہرے نشان چھوڑ دیئے تھے۔

مگر اُن کے دل رکھنے کے لیے کہ دیا کرتا کہ ''اب ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں وہ سب کچھ بھولنے لگا ہوں''۔

کیونکہ جو میرے ساتھ ہوا اُس کے بعد یہ لوگ ڈر گئے کہ کہیں ایسا کچھ نہ کر و جس کی وجہ سے مجھے اور سہنا پڑے۔کیونکہ ثانیہ کے خاندان والوں نے جو کیا وہ نہ معاف کرنے کے لائق ہے نہ بھولنے کے۔مگر میں چاہ رہا تھا کہ میں ثانیہ سے بات کروں۔میں اُس کا حال جاننا چاہتا تھا، میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔مجھے پتہ تھا کہ یہ ناممکن ہے مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

اگلے دن میں احتشام سے ملنے گیا۔میں نے اُسے کہا ''میرے پاس کچھ دن ہیں، یہ آخری موقع ہے اس کو ہاتھ سے جانے مت دینا''۔

اُس نے جواب دیا ''مواقع کب کے ختم ہو چکے ہیں''۔

مجھے اُس کے جواب پہ خیرانگی ہوئی ''کیا مطلب؟''

وہ سخت لہجے میں بولا ''مطلب تم خود نکال لو۔سوچو اتنا سب ہونے کے بعد کیا وہ سکول جا سکتی ہے''۔

میں منہ بناتے ہوئے ''میں سمجھا نہیں''۔

میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''یہی تو بُری بات ہے تم میں کہ تم وقت اور حالات کو سمجھتے نہیں۔جو دل میں آتا ہے کر لیتے ہو بھائی میرے وقت کی نزاکت کو سمجھو''۔

میں اُس کی ایک بات بھی نہیں سمجھا تھا ''میں کوئی فلاسفر نہیں کہ اتنی موٹی بات سمجھ لوں سیدھی سیدھی بات کرو ہوا کیا ہے''۔

ادھر اُدھر دیکھ کر دھیمی آواز میں کہنے لگا ''کزن نے بتایا کہ وہ اُن واقعات کے بعد سکول نہیں جاتی''۔

مجھے یقین نہیں آیا ''یہ تم کیا کہ رہے ہو''۔

اُس نے دانت بجاتے ہوئے کہا ''وہی جو تم سُن رہے ہو۔تم نے اپنی زندگی کے ساتھ کئی اور زندگیوں کو بھی آگ میں دھکیل دیا ہے اور یہ ایسی آگ ہے جو دن بہ دن زیادہ ہوتی جا رہی ہے''۔

اُس کی یہ باتیں سُن کر میرا دماغ اُبلنے لگا اور دل گلے تک آنے لگا، چہرہ سُرخ ہونے لگا۔میری نظروں کے سامنے ثانیہ کی وہ مار، اُس کے آنسو، اور جلال کی موت آئی۔میری طبیعت اچانک بگڑ گئی۔

میں نے کہا ''تم بکواس کر رہے ہو میں نے کسی کی زندگی برباد نہیں کی۔میں نے کسی کی زندگی برباد نہیں کی۔تم۔تم جھوٹ بول رہے ہو۔تم میرے دوست۔۔۔ہو ہی نہیں سکتے۔دفعہ ہو جاؤ''۔

میرے سر میں شدید قسم کا درد اُٹھنے لگا ''آہ آہ آہ۔۔میرا سر''۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں زور سے پکڑا اور زمین پہ بیٹھ گیا۔جب اُٹھ کر چلنے لگا تو لڑکھڑانے لگا، احتشام نے سہارہ دیا مگر میں نے اُسے دھکا دے کر اپنے آپ سے دور کیا اور گھر پہنچ کر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیا۔سر کا درد بڑھتا گیا اور جسم سے آگ سی نکل رہی تھی۔قمیض اُتار کر پنکھے کے نیچے لیٹ گیا۔احتشام کی وہی باتیں میرے دماغ میں گھوم رہی تھی۔گھر میں کسی نے اس وقت مجھے نہیں دیکھا تھا۔شام تک کمرے میں بند رہا۔جو کوئی بُلانے آتا تو سونے کا بہانہ کر کے ٹال دیتا تھا۔

اتنے وقت میں، میں نے ہر اُس غلطی پہ افسوس کیا جو میں نے کی تھی، ہر اُس بات پہ جس پہ میں نے لوگوں کا دل توڑا تھا، ہر اُس کام پہ جس سے کسی کو تکلیف ملی تھی، ہر اُس قدم پہ جس سے مجھے روکتے رہے۔حالات نے مجھے گھٹنے ٹیکنے پہ مجبور کیا۔میری لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی مگر وقت نے مجھے ہتھیار گرانے پہ آمادہ کیا۔میری محبت کم نہیں ہوئی تھی مگر رشتوں نے مجھے کمزور کیا۔میں اپنے گناہوں کی معافی لیے خدا سے مخاطب ہوا۔اپنی نافرمانی پہ پشیماں ہو کر میں ابو اور تایا کے پاس معافی کے لیے گیا۔میں ہر اُس شخص کے پاس گیا اور معافی مانگی جسے میری فکر تھی۔سب نے دل سے معاف کیا۔جب انسان معاف کرتا ہے خدا اُس سے پہلے معاف کرتا ہے۔میں خوش تھا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا لیکن ایک چیز جو مجھے ستا رہی تھی وہ ثانیہ کا حال تھا۔باقی جتنے دن میں نے گاؤں میں گزارے گھر سے باہر نہیں گیا۔جو کچھ ہاسٹل کے لیے چاہیئے تھا وہ میں نے بھائی کو بتا دیا تھی اُس نے

لادی۔اتوار کی شام ہم ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔

رات کو ہاسٹل پہنچے وہاں ذاہد شاہ صاحب نے ہمارا استقبال کیا پھر اُنہوں نے ہمیں پورا سکول دکھایا۔پھر اُنہوں نے مجھے اپنا کمرہ دکھایا،کمرے کے بارے میں جو میری امیدیں تھی وہ ایک پل میں ٹوٹ گئی۔میں نے سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک کمرے میں دو سے چار لڑکے ہونگے مگر یہ تو میری امیدوں سے دس گناہ زیادہ تھا۔یہاں پہ کمرے میں بارہ سے لے کر چودہ لڑکے ہوتے ہیں۔ہمارا کمرہ تیسری منزل کے مین گیلری کے داہنے طرف تھا،ڈائنگ ہال کے بائیں طرف اور وارڈن کے کمرے کے سامنے تھا۔

بھائی لوگ رخصت ہونے لگے تو نگار صاحب نے مجھے کہا کہ ''جاؤ کھانا کھالو''۔

کھانا کھایا،کھانے کے بعد گھنٹی بجی،سب نے اپنے کتابیں لیں اور سٹڈی کے لیے چلے گئے۔کھڑکی میں کھڑے ہو کر اپنے بیتے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ثانیہ کو میری وجہ سے بہت تکلیفیں ملی اور اُسے اپنے ہی گھر میں قید کر لیا گیا۔اُس کے ہر خوشی کا میں ہی قاتل ہوں۔نہ میں اُس سے پیار کرتا نہ اظہار کی ضرورت ہوتی نہ اُسے اتنا سہنا پڑتا۔اور خود ایسی جگہ میں پھنس گیا کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اتنے میں ایک شخص اندر آیا اور ایک بیڈ پہ لیٹ گیا۔ایسے بیڈ پہ پھیل گیا جیسے بیڈ پہ بیڈ شیٹ۔جیسے پورا دن مزدوری کر کے آیا ہو اور بہت تھکا ہوا ہو۔ایسی لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا جیسے پولیس سے بھاگ کے آیا ہو۔پہلے تو اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔

مگر جب دیکھا تو پوچھا کہ ''تم کون ہو''۔

میں نے کہا کہ ''میں آج آیا ہوں اور یہاں پہ نیا ہوں''۔

میں نے پوچھا ''اتنی لمبی لمبی سانسیں کیوں لے رہے تھے بھاگ بھاگ کے آئے ہو کیا؟''

افضال مسکراتے ہوئے ''نہیں مڑا میں بیمار ہوں اور ابھی ہسپتال سے آیا ہوں''۔

کوئی خطرناک بیماری ہوگی اس لیے میں نے اُس کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔میرے ذہن میں عجیب اور خطرناک بیماریوں کے نام آرہے تھے۔جیسے ایڈز،کینسر، T,B وغیرہ۔میں نے سوچا کہ اُس سے دور رہوں کیا پتہ پھیلنے والی بیماری ہو۔میں لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر میں سٹڈی ختم ہوئی اور باقی بھی آ گئے مگر میں نے ظاہر کیا کہ میں سویا ہوا ہوں۔مجھے نیند جلدی آ گئی۔

اچانک کسی نے میرے سر پہ پستول رکھ لی۔میں نے جلدی سے آنکھیں کھولی تو دیکھا ثانیہ کا پورا خاندان آیا ہوا تھا۔

اُس کے تایا نے کہا ''تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم دور آ گئے تو ہم سے بچ جاؤ گے۔ہم تو یہی چاہتے تھے کہ تم کہیں اپنے خاندان سے الگ ہو اور ہم تمہیں قتل کریں''۔

اُس کے ابو بولے ''پچھلی دفعہ تو میں نے تمہاری طرف تھا اب مزہ آئے گا جو یہ لوگ تمہارے ساتھ کریں گے''۔

پاگل نے مجھے گردن سے پکڑ کر فرش پہ گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔آج مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔کمرے والے لڑکے سب مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔مگر میں مطمئین تھا، یہ لوگ جو بھی کرتے مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی۔کیونکہ مجھے اپنی پرواہ نہیں جو چھینا تھا وہ ان لوگوں نے چھین لیا تھا۔

پاگل نے میرا منہ پکڑتے ہوئے کہا ''دل تو کرتا ہے کہ تمہارے اتنے ٹکڑے کروں کہ نہ دفنانے کے لائق ہو نہ جلانے کے،اور سُنا ہے کُتے انسان کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔تمہارا گوشت وہ بہت پسند کریں گے''۔

''تب ہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟''۔میں نے تنزیہ انداز میں کہا۔

وہ اور بھی غصہ ہوا اور مجھے گلے سے پکڑ کر کھڑکی میں کھڑا کیا اور کہا ''تمہیں پتہ ہے میں تیرے ساتھ کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''ہاں مگر پھر یہ بھی جانتے ہونگے کہ میرے گھر والے بدلہ بھی لیا کرتے ہیں''۔

اس سے وہ بھڑک اُٹھے اور مجھے کھڑکی سے باہر اُچھال دیا میں نیچے گرنے لگا میں نے چیخ ماری اور میری آنکھ کھل گئی دیکھا تو بیڈ سے نیچے گرا تھا۔شاید میری چیخ صرف خواب میں تھی اس لیے کوئی جاگا نہیں سارے مزے سے سوئے ہوئے تھے۔مجھے تو اُس کے بعد نیند نہیں آئی صبح ہونے تک جاگتا رہا۔

صبح ناشتہ کے بعد تیار ہونا تھا مگر مسلہ یہ تھا کہ پہلے میں نے کبھی پینٹ نہیں پہنی تھی۔خیر پینٹ اور شرٹ لیں اور باتھ روم جانے لگا تو ایک لڑکے نے کہا کہ ''اپنے ساتھ انڈر ویر تو لے کے جاؤ''۔

یہ ایک ایسی بلا کا نام ہے کہ جس کو پہنتے نیچے ہیں مگر سانس اُوپر بند ہوتی ہے۔اسے جتنا بھی نیچے کروں یہ اُوپر چھڑتا جاتا ہے۔اور اتنا چپک کے رہتا ہے کہ جیسے چھپکلی دیوار سے۔ اسکا فائدہ بھی ہے اور یہ کہ جب بھی تمہاری پھٹ جائے پینٹ تو تب تمہاری عزت بچائے گا۔سوال یہ تھا کہ کیا میری بھی پھٹ سکتی ہے پینٹ۔سوال عزت کا تھا پہنا پڑا۔کچھ بچانے کے لیے کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔میں باتھ روم گیا اور پینٹ شرٹ پہن لی مگر بہت اچھا لگا کیونکہ سب کچھ ٹائٹ ہو گیا تھا اور ہلکا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ انڈر ویر نے کافی بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

اسمبلی ہوئی، کلاسیں لیں، چھٹی ہوئی، ہاسٹل آیا، کھانا کھایا، سٹڈی کے لیے گئے، رات کے کھانے کے بعد پھر سٹڈی تھی اور اُس کے بعد سب اپنے بستر میں۔یہی روز ہوتا تھا، دن گزرتے گئے اور لڑکے میرے دوست بنتے گئے۔ایک ہفتے میں میں نے کافی دوست بنا لیے تھے۔

عبدالصمد جن کو ہم شیخ کہ کر بُلاتے تھے، نیم پاگل تھا، خوبصورت لڑکوں کو تنگ کرتا تھا۔ ہر وقت کسی خوبصورت لڑکے کو پکڑ کر اُس کے پاس بیٹھتا تھا اور اُن کے ساتھ گپ لگاتا تھا۔

شکیل چائنیز شکل کا تھا۔اُس کا بلتستان سے تعلق تھا۔ناک میں بولتا تھا اور یہ بھی شیخ کی طرح خوبصورت لڑکوں کا دیوانہ تھا مگر یہ اُن سے بات کرنے سے شرماتا تھا۔

جمیل یہ شکیل کا کزن تھا اور اُس کی طرح چائنیز شکل کا تھا۔اس کا قد چھوٹا تھا اور اس میں بھی لڑکوں والی بیماری تھی مگر یہ اپنے کزن سے تیز تھا۔

حسن اور حسین دو جڑوا بھائی تھے، مرادن سے تعلق تھا۔ایک جیسی شکل ہونے کی وجہ سے لڑکوں کو غلط فہمیاں ہوتی رہتی تھیں۔دونوں بہت اچھے تھے بس حسن بولتا زیادہ تھا اور اکثر جھوٹ بولتا تھا اور حسین اُس کی تصدیق میں اُس کی وکالت کرتا تھا۔دونوں مجھ سے ایک جماعت آگے تھے۔

اور بہت دوست تھے مگر یہ اُن میں سب سے اچھے والے تھے۔

شیخ سب کو تنگ کرتا تھا اس لیے اُس نے مجھے بھی تنگ کرنے کا پلین بنایا۔میرے ساتھ حسن تھا اور ہم اُوپر ہاسٹل جا رہے تھے کہ راستے میں شیخ ملا۔

اُس نے مجھے کہا ''چھوکرے کیسے ہو''۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کس سے کہ رہا ہے۔تو کہا ''اوے! تم سے کہ رہا ہوں''۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہوں''۔

کہنے لگا ''آج تمہارے ساتھ کمرے میں جاتا ہوں۔تا کہ تم سے دو چار باتیں کر سکوں''۔

ہم کمرے میں گئے کوئی نہیں تھا ہم جا کر بیٹھے۔شیخ نے حسن کے کان میں کچھ کہا تو حسن ہنسنے لگا۔شیخ آیا اور میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔میں سمجھ گیا کہ کوئی شرارت کریگا۔میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ''ہائے یہ نرم نرم ہاتھ''۔

جیسے اُس نے یہ کہا میرے ہوش اُڑ گئے کہ یہ کیا کہ رہا ہے۔

وہ کہتا رہا ''تمہارے گلابی ہونٹ''۔

میں بے بس تھا کچھ کہ نہ پایا بس اُس کی باتوں پہ ہنستا رہا۔باتیں وہ ایسے کر رہا تھا اور شرم مجھ کو آرہی تھی۔مجھے اُس سے ڈر لگا کہ یہ واقعی ایسا ہے۔

وہ کہتا رہا ''تمہاری انکھیں اُف خدایا!!!''

آرے کوئی اسے روکے یہ تو سچ میں خطرناک ہے۔وہ ایسے انداز میں کہ رہا تھا کہ مزاق کا گمان بھی نہیں ہوا۔جیسے اُس نے میرے چہرے پہ ڈر کے آثار دیکھ لیے تو ہنسنے لگا اور حسن سے کہا ''دیکھو دیکھو اس کے چہرے کو''۔

میرا چہرا سچ میں دیکھنے کے لائق تھا کیوں کہ ایسا ڈر شاید کہ پہلے مجھے ہوا ہو۔دونوں مجھ پہ ہنس رہے تھے اور میں اپنے آپ پہ ہنس رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنجیدہ کرتے ہوئے کہا ''آئندہ میرے ساتھ ایسا مزاق مت کرنا''۔

حسن ہنستے ہوئے بولا ''تم تو سچ میں ڈر گئے''۔

شیخ ہنستے ہنستے اپنا پیٹ پکڑ کر بولا ''میں نے کہا تھا نہ کہ ڈر کے مارے اس کا گلہ خشک ہو جائے گا''۔

میں نے شکر ادا کیا کہ کسی اور کو اس بات کا پتہ نہیں چلا۔(یہ بات شیخ اب بھی مجھے یاد دلاتا ہے)۔

شیخ، شکیل اور کچھ اور دوست ہمارے کمرے میں شفٹ ہوئے، کافی شُغل لگنے لگا۔پہلے ٹرم امتحان دو، ڈھائی ہفتہ بعد ہونا تھا۔میں نے تیاری شروع کی کیونکہ مجھے پتہ تھا گھر

ایک دن چھٹی کے بعد جب کمرے آیا تو میں نے جا کر اپنی الماری کھولی کپڑے نکالے اور باتھ روم جانے لگا تو کیا دیکھا کہ شکیل نے ایک کونے میں جا کر پٹ سے پینٹ اُتاری ، جیسے میری نظر اُس پہ پڑی تو میں نے منہ دوسرے طرف کر دیا مگر میرے دل میں آیا کہ دیکھوآخر یہ کر کیا رہا ہے۔ جب میں نے منہ اُس کی طرف کیا تو وہ پینٹ اُتار چکا تھا اور خالی انڈرویر میں کھڑا تھا یہ ایسے کپڑے تھے جو انگریز لوگ ساحل سمندر پہ پہنتے ہیں۔ اُن پہ تو بے شرمی کی انتہا ہے لیکن اسے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے کبھی ایسا نظارہ براہراست نہیں دیکھا تھا۔

جب میں جانے لگا تو ٹراوزر پہنتے ہوئے مجھے کہا کہ ''کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے کپڑے دکھاتے ہوئے کہا ''غسل خانے''۔

وہ بڑے فخر سے بولا ''اس میں غسل خانے جانے کی کیا ضرورت ہیں۔ بس ایک اُتار و اور دوسری پہن لو''۔

میں بولا ''میں ایسے کپڑے بدلنے سے پہلے شرم سے مر جاؤنگا''۔

وہ ہنس پڑا اور کہا ''یہ ہاسٹل ہے یہاں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی یہاں آ کر سیکھا ہے''۔

میں نے جواب میں کہا ''جو بھی ہو میں ایسا نہیں کرونگا اور نہ یہاں سے کچھ ایسا سیکھونگا''۔

ہماری روٹین وہی چلتی رہی، سٹڈی اور پھر چائے مگر آج اُن میں کچھ نیا ہوا۔ شام کو جب میں نیچے اُتر رہا تھا تو میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ دیکھا جس میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کرسی صاف کی اور اُس پہ بیٹھ گیا۔ اُس جگہ گراونڈ کی طرف شیشے لگے ہوئے تھے جس میں سے وہاں بیٹھے لڑکے اور روڈ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہاں کوئی نہیں آنے والا اس لیے وہاں بیٹھ کے کبھی باہر دیکھتا تو کبھی گراونڈ میں بیٹھے لڑکوں کو۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں یہاں بھی کتنا اکیلا ہوں۔ مجھے ثانیہ اور جلال کی بہت یاد آئی اور میں رو پڑا بہت رویا کہ میری سسکیاں بن گئی لیکن مجھے اپنے آپ پہ قابو پانا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اُن کے ساتھ گزرہ اچھا وقت یاد کرنے لگا مگر کمبخت وہ رات یاد آ ہی جاتی تھی۔ اور جب بھی یاد آتی ہے میں ڈر جاتا ہوں، یادوں میں ہی سہی مگر جلال کو پھر کھو دونگا، ثانیہ سے پھر الگ ہو جاؤنگا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ لیا اور ایک پل کے لیے میں نے سوچا کہ یہ وہی رات ہے اور میں اُسی کرسی پہ باندھا گیا ہوں مگر پیچھے دیکھا تو حسن تھا۔

اُس نے کہا ''کس سے چُپ رہے ہو، یا کس نے کچھ کہا ہے جو یہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہو؟''

میں نے سسکتی آواز میں کہا ''یہ جگہ دل کو اچھی لگی تو بس آ کر بیٹھ گیا''۔

وہ چونک کہ بولا ''وے! تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے، کیا تم رو رہے تھے؟''

میں اُسے بتا نہیں سکتا تھا اس لیے مسکرا کہ کہا ''نہ مڑا، بلا میں کیوں روں۔ شاید کوئی یاد کر رہا ہے اس لیے سسکیاں بن رہی ہیں''۔

وہ میری بات پہ حیران ہوا اور بولا ''کسی کے یاد کرنے سے سسکیاں آتی ہے۔۔۔ خیر جو بھی ہو ہم کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ شیخ تو کہہ رہا تھا کہ تم گھر بھاگ گئے ہو گے۔ چلو سب نیچے ہیں تمہارا انتظار کر رہے ہیں''۔

میں سوچنے لگا کہ سب مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں، میں اُس کے ساتھ نیچے گیا۔ تب پتہ چلا کہ کینٹین سے چیزیں لینے کی باری میری ہے۔ ہر روز لڑکے عصر کے وقت کرکٹ کھیلنے گراونڈ میں جاتے تھے لیکن میں بہت کم جایا کرتا تھا۔ اگلے دن عصر کے وقت ہم کرکٹ کھیل رہے تھے کہ میری نظر جلال پہ پڑی جو کہ ایک لڑکے کے ساتھ کینٹین جا رہا تھا۔ میری آنکھیں حیرانگی سے بڑی ہو گئی۔ میں نے اپنی آنکھیں مل لئے کہ کیا میں سچ میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا اور میں کرکٹ چھوڑ کر اُوپر بھاگ کے چلا گیا۔ میں پریشان تھا کہ کیا یہ اُس کا بھوت تھا یا وہ میری خیالوں میں تھا اس لیے نظر آیا۔ میں جا کر کل والی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ وہ سچ میں یہاں تھا کینٹین سے جوس لے کر وہ شکیل کے پاس کھڑا ہو گیا اور اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ میرا گلہ خوشک ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ کرنا تھا کہ یہ کون ہے اس لیے میں پھر نیچے گیا وہاں حسن کے پاس گیا اور اُس سے پوچھا کہ ''یہ کون ہے؟''

اُس نے کہا ''وہ؟ نعمان نام ہے۔ جونئر ہاسٹل میں ہوتا ہے۔ تم نے پہلے اسے نہیں دیکھا؟ یہ تو روز نیچے آتا ہے''۔

میں نے کہا ''نہیں! میں اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں''۔

پھر میں نے پوچھا ''کہاں کا ہے؟ اور یہاں پہ کب سے ہے؟''۔

کہنے لگا ''کشمیر کا ہے اور تقریباً ایک سال سے یہاں ہے''۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا ''مجھے اس سے دوستی کرنی ہے''۔

اُس نے کہا ''ہاں کیوں نہیں، یہ ہر کسی کے ساتھ دوستی کرتا ہے، بہت اچھا انسان ہے''۔

ہم اُس کے پاس گئے اور اُس سے تعارف ہوئی۔ دور سے بالکل جلال کی طرح لگ رہا تھا لیکن قریب سے پتہ چلا کہ صرف اُس کی طرح لگ رہا ہے۔ میں اُس کو جلال سمجھ کر دیکھ رہا تھا کہ شکیل نے کہا ''کیوں ایسے دیکھ رہے ہو پسند آ گیا کیا؟''

مجھے اُس کی بات پہ غصہ تو آیا مگر ظاہر نہیں کیا اور کہا ''اپنی طرح سمجھتے ہو کیا؟ تم اور شیخ کو تو بہانا چاہئے کسی خوبصورت لڑکے سے بات کرنے کے لیے''۔

میری بات پہ سب ہنس پڑے۔

مجھے بہت اچھا لگا اُس سے مل کر۔ وہ جلال نہیں تھا مگر اُس کا چہرہ اور اُس کی کچھ عادتیں جلال سے ملتی تھیں اس لیے میرا دل اُس سے دوستی کرنے کی طرف بہت مائل تھا۔ امتحان نزدیک تھا اس لیے کھیلنے کے لیے کم گراونڈ میں آتے تھے اور نعمان سے ملاقات کم ہوتی تھی۔ میری نعمان میں زیادہ دلچسپی ہونے کی وجہ سے ساری باتیں بنانے لگے کہ وہ مجھے پسند ہے۔ وہ مجھے بہت پسند تھا مگر ویسا نہیں جیسا وہ سمجھ رہے تھے۔ میں نے سب کو سمجھایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے مگر کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

شیخ نے مجھ پہ ہنستے ہوئے کہا ''تم ہم پہ ہنستے تھے کہ ہم لڑکوں کو پسند کرتے ہیں اور اب خود اس جال میں پھنس گئے''۔

شکیل نے کہا ''میں نے کہا تھا جو بھی یہاں آتا ہے یہاں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے''۔

میں نے اُنہیں سمجھاتے ہوئے کہا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ میرے ایک دوست کی طرح لگ رہا ہے۔ اس لیے مجھے اُس سے اتنی لگاؤ ہے''۔

شیخ کنجرو جیسے ہنستے ہوئے بولا ''مجھے بھی جب کوئی لڑکا پسند آ جاتا ہے تو میں بھی ایسے بہانے بناتا ہوں اور اُسے اپنے جال میں پھنسا دیتا ہوں''۔

میں نے کہا ''مجھے اپنی طرح مت سمجھو میں ایسا نہیں ہوں''۔

شکیل بولا ''نہیں بھائی! تم ایسے نہیں تھے لیکن اب ہو گئے ہو''۔

شیخ نے کہا ''اس میں شرمانے کی کیا بات ہے یہاں سب ایسے ہی ہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ مجھے دیکھو مجھے اپنی کلاس میں مزمل بہت پسند ہے۔ میرا دل اُس کے پاس ہے''۔

شکیل نے اُسے کہا ''خیال کرنا اُس کے عاشق بہت ہیں''۔

شیخ نے اُسے جواب ایک شعر میں دیا ''آ جا رقیب میرے تجھے گلے سے لگاؤں

میرا عشق بے مزا تھا تیرے آنے سے پہلے''۔

یہ شعر کہ کر وہ خود بھی ہنس پڑا اور ہمیں بھی ہنسایا۔ لیکن یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں اگر ان کو میں اپنا سچا واقع بھی سُناؤں تب بھی یہ لوگ یقین نہیں کرنے والے تھے اس لیے میں نے اُنہیں بولنے دیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کیا فرق پڑتا ہے یہ لوگ جو بھی سوچتے ہیں میرے بارے میں۔ مجھ میں یہ بات ہے کہ جیسا ماحول ہو میں اُس میں اُسی طرح اپنے آپ کو بنا لیتا ہوں اس لیے یہاں بھی مجھے ان جیسا روپ دھارنا تھا۔ لیکن فی الحال مجھے اپنے پڑھائی پہ دھیان دینا تھا۔ ایک دن میں اپنے بیڈ پہ بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ پیچھے جونئر ہاسٹل کے ایک کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں مجھے ایک لڑکی نظر آئی۔ تو سب کو آواز دی کہ دیکھو پٹاخہ۔ سب اپنا اپنا کام وغیرا چھوڑ کر جلدی سے دیکھنے لگے۔

لنگر نے دیکھ کر کہا ''نہ دیکھ اپنی بابی کو شرم نہیں آتی''۔

شیخ بولا ''شرم تو تمہیں آنی چاہیں کہ اپنی بابی کو بیوی سمجھ رہا ہے''۔

لنگر خوشی سے اُچھلتا ہوا بولا ''دیکھ دیکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ تم کباب میں ہڈی کیوں بن رہے ہو''۔

واقی اُس لڑکی نے دیکھا ہمیں اور ایک بچے کو کھڑکی بند کرنے کا کہا وہ آیا اور کھڑکی بند ہو گئی اور سارے ایسے افسردا ہو گئے جیسے سچ میں اُن کی بیوی ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو حسن بھی آیا تھا اور یہ سب دیکھ رہا تھا۔

میں نے خیرت سے کہا ''تم بھی ایسے کام کرتے ہو''۔حالانکہ میں خود دیکھ رہا تھا۔

حسن بولا ''تو اس میں اتنا خیران ہونے والی کونسی بات ہے یہ تو سب کرتے ہیں''۔

میں نے کہا ''سب کی بات الگ ہے مگر میں تو تمہیں شریف سمجھ رہا تھا''۔

شکیل بول پڑا ''جو ماڈرن میں آ گیا وہ شریف نہیں رہتا۔اب اپنے آپ کو ہی دیکھو''۔

امین کہنے لگا ''اپنی تو کسی کو نظر نہیں آتی بس دوسروں پہ کیچڑ اُچالتے ہیں''۔

وہ سچ کہہ رہا تھا میں کچھ ہی دنوں میں کچھ زیادہ مست ہو گیا تھا۔یہ لوگ اتنے اچھے تھے کہ مجھے لگا میں اپنے گھر میں ہوں۔

کچھ دنوں میں امتحان شروع ہو گیا اور پرچے کافی اچھے ہونے لگے۔امتحان کے کچھ ہی دنوں بعد نتیجہ بھی آ گیا۔نتیجہ کی صبح کلاس ٹیچر آئے اور ہمیں نتیجہ سنانے لگے۔میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔اُنہوں نے پہلی پوزیشن والے سے شروع کی۔

''شجاع۔۔۔پہلے نمبر پہ''۔سب تالیاں بجانے لگے۔''دوسرے نمبر پہ۔۔۔لقمان''۔

اور تالیوں کی آواز پھر سنائی دی۔''اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔''۔

اُنہوں نے نام نہ لیا اور مجھے دیکھنے لگے۔شجاع نے بے چینی سے پوچھا کہ ''تیسرا کون ہے''۔

سر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ لڑکا''۔

ایسا لگا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں اس لیے اپنے اُنگلی کو کاٹا مگر یہ سچ تھا۔ہماری سیکشن میں سب نالائق تھے اس میں پوزیشن لینا یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی لیکن میرے لیے تھی کیونکہ میں نے کبھی کوئی پوزیشن حاصل نہیں کی تھی میں تو کلاس میں سب سے آخری نمبر پہ آتا تھا۔جب میرے لیے تالیاں بجیں تو بہت اچھا لگا اور اس سے میرا حوصلا بڑھ گیا اور مجھے پتا چلا کہ میں اس سے اچھا کر سکتا ہوں۔مجھے اس پر بھی خوشی تھی کہ میں گھر والوں کو بتاؤنگا تو وہ لوگ بہت خوش ہونگے۔چھٹی کے بعد کمرے میں سارے ایک دوسرے سے نتیجے کے بارے میں پوچھ رہے تھے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے بڑے فخر سے کہا کہ ''میں تیسرے نمبر پہ آیا ہوں''۔

سب یہ سن کر میری طرف متوجہ ہو گئے میں نے سوچا کہ یہ میرے تیسرے نمبر پہ آنے کی وجہ سے خیران ہیں۔

مگر شیخ نے کہا کہ ''اب مزا آئے گا تم تو پھنس گئے بچے۔یہاں کا رواج ہے جو کوئی بھی پوزیشن لیتا ہے وہ کھانا کھلاتا ہے''۔

یہ سن کر میری ساری ہوا نکل گئی۔پورے کمرے کے لڑکوں کے لیے کھانا اتنے پیسے میرے پاس نہیں تھے اور اگر نہ کرتا تو مجھے شرمندہ کرتے۔میں اس بات پہ سوچ رہا تھا کہ شکیل نے ایک تجویز دی کہ ''آخری آخری دن ہیں کسی کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں اس لیے سارے اکٹھے کر لیتے ہیں اور یہ تھوڑا زیادہ ڈال لیگا''۔

شیخ نے غراتے ہوئے کہا ''میرے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں ہے''۔

شکیل نے کہا ''تو پھر تم کھانا بھی نہیں کھاؤ گے''۔

شیخ غصہ میں بولا ''کیوں نہیں کھاؤنگا۔اس نے پوزیشن لی ہے تو یہ کھلائے گا یہ ہم نے طے کیا تھا''۔

شکیل نے جواب دیا ''یہ اس لیے کہا تھا کہ تم کوئی پوزیشن نہیں لے سکتے''۔

مجھے شکیل کا ہر جواب بہت پسند تھا کیوں کہ اُس سے سب کی پھٹ جاتی تھی اور اُس کے بعد کوئی بولتا نہیں تھا۔شکیل کی بات پہ شیخ کے علاوہ سب نے اتفاق کیا اور ہم نے پیسے اکٹھے کیے اور شیخ کا حصہ بھی میں نے ڈالا۔رات کو منگوایا ہوا کھانا آیا جو کہ پراٹے اور کباب تھے۔جس کو کھانے کے بعد سب نے گھر جانے کے لیے تیاری شروع کی میں نے بھی کپڑے بیگ میں رکھے۔سب بہت خوش تھے مجھے بھی گھر جانے کی خوشی ہو رہی تھی پہلی بار اتنا وقت باہر گزار کر گھر جا رہا ہوں کیا گھر والے میرے آنے سے خوش ہونگے؟ میں اپنے بیڈ پہ ایسے ہی لیٹ گیا اور یہاں آنے کے بارے میں سوچا کہ کیسے آیا اور دھیرے دھیرے اس کے رنگ میں رنگتا گیا۔ایسا تھا کہ کسی جگہ پہ بہت اندھیرا ہو اور میں اُس اندھیرے میں کھو گیا ہوں۔مگر اس نئی جگہ نے مجھے نئے اور بہت اچھے دوست دیئے۔اور مجھے نعمان جو جلال کا عکس تھا وہ مل گیا تھا جس سے مجھے کافی سکون ملا۔

اُس رات شیخ کمرے میں کہیں سے ٹیپ ریکارڈر لایا اور سب نے اُچھلنا شروع کیا۔ گانا لگتے ہی سب میدان میں اُتر کر ناچنے لگے۔ شیخ نے مجھے بھی اُٹھایا مگر میں نے معزرت کی مگر وہ نہ ماننے والا تھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نچانے لگ گیا۔ ان لوگوں کے پیار نے مجھے کچھ دنوں کے لیے اپنے دنیا سے الگ کیا مگر اس جھومتے ناچتے رات میں مجھے وہی لوگ یاد آئے جنھوں نے میرے لیے بہت زخم برداشت کئے اور اس کے ساتھ ہی میرا چہرہ مرجھا گیا اور مجھ سے اور ناچنا نہیں ہوا۔ شیخ نے مجھے پریشان دیکھا مگر اُس وقت کچھ نہیں کہا میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

شکیل میرے پاس بیٹھا اور کہا ''آج اتنا چپ چپ کیوں ہے خیر تو ہے۔ کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟''

میں نے کہا ''نہ مڑا مجھے کوئی کچھ کیوں کہے گا میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے''۔

شکیل بولا ''تو پھر کیا وجہ ہے پہلے کبھی اتنا خاموش اور پریشان نہیں دیکھا''۔

کیسے کہوں اسے کیسے سمجھاؤں۔ مجھے چپ ہی رہنا پڑا مگر مجھے اُسے یقین دلانا تھا کہ میں خفہ نہیں ہوں۔

مسکراتے ہوئے ''کل گاؤں جاؤ نگا تو تم لوگوں کی یاد آئیگی''۔

شکیل مطمین ہو کر ''ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہے نہ ایک مہینے کے بعد پھر ملیں گے''۔

میں نے اپنا غم مسکراہٹ میں چھپالیا اور ناچنے والوں کے لیے تالیاں بجانے لگا۔

شکیل بولنے لگا ''تم مسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہو تمہارے چہرے پہ پریشانی اچھی نہیں لگتی''۔

جلال نے بھی ایک دن مجھے ایسا ہی کہا تھا۔ مجھے بالکل ویسے لگا اور میں شکیل سے گلے لگ گیا۔ میری انکھوں میں آنسو آ گئے۔

اگلے دن مجھے لینے کے لیے جواد بھائی آئے ہوئے تھے۔ ایک مہینے کے لیے میں واپس اپنے گھر جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سامان اُٹھایا، سب سے رحصتی لی اور سکول سے باہر نکلا۔

جواد بھائی نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور وہ واپس اپنے کام پہ چلے گئے۔ پشاور پہنچا تو شہزاد لینے آیا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا میرے آنے پہ۔

شہزاد کہہ رہا تھا کہ ''سب ٹھیک ہو گئے ہیں اب کچھ بُرا نہیں ہونے والا''۔

میں نے کہا ''مجھے عجیب لگ رہا ہے، ڈر لگ رہا ہے''۔

شہزاد بولا ''تم جب سے گئے ہو ابو پریشان رہتے تھے آج اُنہوں نے مجھے خود کہا کہ اُسے لینے کے لیے جاؤ''۔

میں نے سنجیدگی سے کہا ''اب کیا فائدہ میری زندگی اُجھاڑ کے''۔

اُس نے کہا ''کچھ نہیں اُجھڑا اب بھی بات بن سکتی ہے۔ وہ۔۔۔۔۔۔''۔

میں نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''نہ شہزاد مہربانی ہو گی کہ اس موزوں کو نہ چھیڑا جائے''۔

وہ مسکرا کر بولا ''اچھا جی مگر گھر میں سب سے خوشی سے ملنا ناراضگی ظاہر مت کرنا''۔

میں نے کہا ''میں تو کر لونگا مگر اُن سے اُمید نہیں ہے''۔

اُس کے اطمینان دلاتے دلاتے گھر پہنچ گئے۔ سب پیار سے مل رہے تھے۔ ابو بھی خوشی سے ملے اور پوزیشن لینے پہ مبارک باد دی۔ میرے لیے میری پسند کے کھانے پکائیں گئے۔ میں خوش ہو گیا کہ چلو گھر والے تو اپنے معمول پہ آنے لگے ہیں۔ مگر پھر بھی میری زندگی کا دائرہ محدود تھا، محدود خیالات، محدود پیارے لوگ۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی رو پڑا اور ہر دیوار سے اور ہر ایک چیز سے لپٹ لپٹ کر خوب رویا۔ میری نظر میرے پاؤں پہ پڑی تو اور بھی مایوس ہوا اور قمیض اُتار کر اپنے جسم پہ ہوئے مظالم دیکھنے لگا۔ میں اپنے کمرے میں اپنی یادوں کے ساتھ کافی رو چُکا تھا۔ آنسوں نے میرے کپڑوں کو گیلا کر دیا تھا اس لیے میں نے کپڑے بدلے اور باہر آیا۔ گھر میں سب کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی بہت باتیں کی، کھیتوں کی سیر کی، بازار سے ہو کر آیا اور اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ چھٹیاں بہت تھیں اور مشغلے کم اس لیے میں تنگ ہونے لگا تھا۔ معمول کے مطابق جب میں بازار گیا تو احتشام نظر آیا۔ میں اُسے نظر انداز کر کے ایک طرف نکلنے لگا کہ اُس نے آواز دی۔

احتشام نے کہا ''سلام دوست کیسے ہو؟''

میں نے کہا ''چل رہا ہوں، سانس لے رہا ہوں تو سمجھو زندہ ہوں''۔

احتشام بولا ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر پایا''۔

میں نے غصہ میں کہا ''یہی افسوس اپنے پاس رکھو کبھی کام آئے گا''۔

وہ کہنے لگا ''ضرور ایسا کرتا، تیرے سامنے بھی نہیں آتا مگر یہ بات تم تک پہنچانا ضروری تھی کہ۔۔۔۔اُس کی منگنی ہونے والی ہے''۔

یہ سننا تھا کہ جیسے میرے سر پہ آسمان گر پڑا ہو، میرے پیروں تلے زمین کھینچ لی گئی ہو، اور دل نے دھڑکن بند کر دی ہو۔

میں نے اُسے گریباں سے پکڑ کر کہا ''یہ۔۔۔یہ کیا کہ رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو؟''۔

اُس نے کہا ''ہاں! میں ہوش میں ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ تمہیں بُرا لگے گا مگر یہی سچ ہے''۔

میں نے درد سے آنکھیں بند کر دیں اور اُس سے پوچھا ''کب ہے اور کس کے ساتھ؟''

کہنے لگا ''۲۴ تاریخ کو اُس کے کزن کیساتھ''۔

مجھ سے وہاں اور کھڑا ہونا برداشت نہیں ہوا اور واپس گھر آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، پاگلوں سی حرکتیں کر رہا تھا۔ پانی پینے گیا گلاس بھرنے لگا تو اُلٹا پکڑا ہوا تھا، کچھ دیر اُلٹے گلاس پہ پانی ڈالتا رہا پھر اُسے چھوڑ کر اپنے کمرے جانے لگا تو دروازے کی بجائے کھڑکی سے گُھس گیا اور بستر کی بجائے فرش پہ لیٹ گیا۔ کچھ دیر پڑا رہا کہ پھوپھی میرے کمرے کا چکر لگاتی ہوئی مجھے فرش پہ پڑا کراہتے ہوئے پایا تو جلدی سے آئی اور مجھے کسی طرح اُٹھا کر بستر پہ لٹا دیا۔ میرے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو اُبل رہا تھا۔ کسی سے کہ کر ڈاکٹر کو بُلایا۔ اُس نے تیز بُخار سمجھ کر دوائی دی۔ سب چلے گئے اور مجھے آرام کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

مسعود بھائی نے شہزاد سے کہا ''لگتا ہے اسے کسی نے منگنی کے بارے میں بتایا ہے''۔

شہزاد بولا ''مسئلہ اُسے پتہ لگنے کا نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ پھر غلط قدم نہ اُٹھا دے''۔

بھائی نے سوچتے ہوئے کہا ''اُسے روکے بھی تو کیسے۔ اپنا غم بتاتا نہیں خود اکیلے ہی اُسے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے دنیا کے بارے میں کیا پتہ ہے وہ تو بس ایک لڑکی کی محبت میں پاگل ہے''۔

شہزاد نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''یہی پاگل پن سب کے لیے خطرہ ہے، خود اُس کے لیے اور دونوں خاندانوں کے لیے بھی۔ میں اُس سے بات کرونگا اور پیار سے سمجھاونگا۔ دیکھتا ہوں کیا بنتا ہے''۔

بھائی نے مسئلے کا حل نکالتے ہوئے کہا ''مجھے لگتا ہے کہ ابو کو بتا دینا چاہئے''۔

شہزاد نے بھائی کو ٹالتے ہوئے کہا ''ایسی غلطی مت کریں اور بھی بگڑ سکتا ہے۔ میں اُس پہ نظر رکھتا ہوں''۔

بھائی بولے ''شائد تمہاری مان لے ہماری بات تو اُس کے کانوں تک نہیں پہنچتی''۔

شہزاد نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا ''یہ آپ مجھ پہ چھوڑ دے''۔

دو دن میں میری آنکھیں صرف کئی گھنٹوں کے لیے کُھلی تھیں۔ آج جمعہ کا دن تھا اور اتوار کو اس کی منگنی ہونے والی تھی میں نماز پڑھ کر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے اُسے محسوس نہیں کرایا اور اُس کی نظروں سے غائب ہونے کے لیے کھیتوں میں گھس گیا اور جب احساس ہوا کہ میں اُس کی نظر سے باہر ہوں تو ایک طرف چُپ کر کے بیٹھ گیا۔ اُس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ آنے لگا تو میں اچانک اُس کے سامنے آنکلا تو دیکھا کہ کُتا ہے جو مجھ سے ڈر کے بھاگ گیا۔ مجھ پتہ تھا کہ کوئی اور میرا پیچھا کر رہا ہے مگر میں نے اُسے نہیں دیکھا۔

اتوار کو بھائی آئے اور کہا ''چلو تیار ہو جاؤ۔ ہم پشاور جا رہے ہیں۔ مجھے پتہ ہے تم گھر میں تنگ ہوئے ہو۔ تو تمہاری ہوا بھی بدل جائے گی''۔

میں نے انکار کرتے ہوئے کہا ''میرا کہیں جانے کا دل نہیں ہے اور ویسے بھی کافی گرمی ہے''۔

بھائی اسرار کرتے ہوئے ''پیدل تو نہیں جا رہے اپنی گاڑی میں جا رہے ہیں۔کبھی ہماری خاطر کچھ کر لیا کرو کبھی ہماری بات بھی مان لیا کرو''۔

میں اپنی بات پہ ڈٹا رہا ''میں نہیں جانا چاہتا، بھائی آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ ضد نہ کریں''۔

بھائی سمجھ گئے اس لیے اُنہوں نے اور کچھ نہ کہا اور چلے گئے۔

وہ گئے ہی تھے کہ جواد بھائی آئے اور کہا ''تم جب سے آئے ہو ایک کمرے میں بند میں بیٹھے ہو۔آج میرے ایک دوست کے ہاں دعوت ہے میں اکیلا ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں ساتھ لے چلوں''۔

'میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے آج گاؤں سے دور لے کر جانا چاہتے ہیں۔

میں نے انکار پہ انکار کرتے ہوئے کہا ''میرا کہیں جانے کا اِرادہ نہیں ہے میں اس بند کمرے میں ہی خوش ہوں''۔

وہ مجھے ایموشنل بلیک میل کرنا چاہتے تھے ''تم میرے اتنی بات نہیں مان سکتے ؟''

اُن کے اس اُمید پہ پانی پھیرتے ہوئے کہا ''بات ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہیں جانے کا دل نہیں کر رہا''۔

وہ اسرار پہ اسرار کرتے رہے ''طبیعت گھر بیٹھے بیٹھے خراب ہو گئی ہے باہر ہوا میں نکلو گے تو صحت خود بہ خود آ جائے گی''۔

میں نے اپنے چہرے پہ اُداسی لاتے ہوئے کہا ''باہر کی ہوا کا عادی نہیں ہوں، میں قید میں ہوتے ہوئے خوش ہوتا ہوں اور آزاد ہونے سے ڈرتا ہوں۔ تو بھائی جان مہربانی کر کے مجھے جانے پہ مجبور نہ کریں میں یہاں ٹھیک ہوں''۔

جواد بھائی بھی نہ اُمید ہو کر چلے گئے۔ منگنی شام کو تھی تب تک میں گھر میں رہا اور مجھے لگا کہ کوئی میری چوکیداری کر رہا ہے۔میرا وہاں جانا بہت مشکل تھا ایک طرف اپنے گھر والے باہر جاتے ہی جاسوسی کرینگے اور دوسری طرف اُن کے گھر گھس کر اُسے دیکھنے میں مشکلات تھیں۔شام سے تھوڑی دیر پہلے میں بازار آیا، بازار میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی خاندان والا موجود تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ سب میرا پیچھا کر رہے ہیں میں نے سوچا کہ میں احتشام کے گھر کی طرف چلوں اگر کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے تو پتہ چل جائے گا۔میں چلنے لگا اور کچھ قدم چلنے کے بعد مُڑ کے دیکھتا تھا۔کچھ دور چلا اور مُڑ کر دیکھا تو شہزاد میری طرف آ رہا تھا لیکن جب اُس نے مجھے مُڑتے دیکھا تو ایک طرف ہو کر چُپ گیا۔مجھے اس سے پیچھا چھُڑانا تھا۔آگے گلیاں گنجان تھیں میں اُن گلیوں میں اُس سے بھٹک گیا۔وہ مجھے وہاں ڈھونڈتا رہا اور میں بھاگتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔میں ایک اور گلی سے ہو کر ثانیہ کے محلے پہنچ گیا

وہاں لوگوں کا ہجوم تھا میں کانپ رہا تھا کیونکہ میں ظالموں کی بستی میں تھا میں اُن کے سامنے کمزور تھا مگر میرا پیار سچا تھا۔اُن کا ڈر مجھ پہ طاری تھا مگر میری محبت میری شانہ بہ شانہ کھڑی تھی۔میرے دماغ نے مجھے ڈرایا مگر میرے دل نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔جب آگ جلی تھی تو جلنا تو تھا ہی۔کچھ لڑکے گلاسوں کی ٹرے گھر لے کر جا رہے تھے میں بھی اُن میں ہو گیا اور ایک ٹرے لے کر اپنا منہ چُھپاتے ہوئے بڑھتا گیا اور لوگوں کے اس بھیڑ کو چیرتا ہوا سیدھا اُس کے گھر گُھس گیا۔اتنے لوگوں میں میرا کیا پتہ چلنے والا تھا۔گھر کے اندر گیا تو دیکھا کہ ایک شاندار سٹیج بنا ہوا تھا اور اُس پہ دلہن بنی بیٹھی تھی میری ثانیہ۔اُسے دیکھتے ہی میرا دل پھیل سا گیا۔

وہ آنکھیں جُھکائے بیٹھی تھی، میں آہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

وہ خوشیاں سمیٹ رہی تھیں، میں غم میں ڈوب رہا تھا۔

وہ کسی کی ہونے والی تھی، میں اُس سے جُدائی میں تھا۔

مگر تڑپ وہ اُس کی بھی تھی اور میری بھی۔

دل اُس کا بھی ٹوٹ رہا تھا میرا بھی۔

آج حُسن اُس پہ برس رہی تھی — آج حوروں سی وہ لگ رہی تھی۔

چاند کی روشنی میں دیکھا تھا اُسے — جو سامنے اُس کے مدھم پڑی تھی۔

میرے دل میں شدید خواہش آئی کہ کاش وہ مجھے دیکھ سکے۔خدا نے اس دُعا کو پوری کرنے میں دیر نہیں کی اور یہ خواہش اُسی وقت پوری ہوئی۔اُس نے اپنی جھکی پلکوں کو اُٹھایا اور لوگوں پہ نظر دوڑانے لگی اور وہ نظر مجھ پہ آ کر رک گئی۔اور وہ آنکھیں جس کو شرم کے مارے نیچے کئے ہوئی تھیں وہ حیرت سے بڑی ہو گئی۔اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے

آنسو آئے اور بغیر آنکھ جھبکائے حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھے یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے خاندان والوں میں سے کوئی مجھے دیکھے۔ مگر میں جانا نہیں چاہتا تھا میں اُسے جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بس دیکھتے ہی رہے۔ کوئی سمجھتا یا نہیں مگر ثانیہ کے ابو جو کہ سٹیج کے پاس تھے ثانیہ کو دیکھ کہ سمجھ گئے کہ کچھ تو ہے۔ میں نے ثانیہ کے ابو کو دیکھ لیا تھا اس لیے پلٹ کے جا رہا تھا کہ وہ سامنے آ کھڑے ہوئے۔

اُن کے پاس ایک بچہ کھڑا تھا اُسے کہا ''جا بیٹا بڑے چچا کو بُلا کہ لاؤ، جلدی''۔

وہ بالکل میرے سامنے تھے اور میرے ذہن میں وہ رات والی ساری کہانی دوڑ پڑی۔ میں کوئی فلم کا ہیرو نہیں تھا جو سب کی پٹائی کر کے ہیروین کو اُٹھا لے جاتا۔ یہاں ۱۵ سال کے ایک لڑکے کے پیچھے دو خاندان لگے ہوئے تھے۔ جو سب سے اچھا دوست کھو چکا تھا اور جس کی محبت اس کے سامنے کسی اور کی ہو رہی تھی۔ اتنی عمر میں اتنی غیرت کافی تھی کہ میں یہاں تک آیا۔ میں نے ثانیہ کے ابو کو ایسا کرنے سے روکنے کے لیے سر ہلایا مگر اُنہوں نے فیصلہ نہیں بدلہ اس لیے مجھے بھاگنے کا سوچنا پڑا۔

جب ثانیہ کے ابو یہ دیکھنے کے لیے مڑے کہ اپنے بھائی کو دیکھے کہ آ رہا ہے کہ نہیں۔ تو میں موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوڑا، میری ٹانگوں میں جتنا دم تھا سارا لگایا کہ یہاں سے نکل سکوں۔ میں نے پیچھے دیکھا کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا کہ کسی سے ٹکر لگی اور پتہ چلا کہ ٹکر پاگل چچا سے ہوئی ہے۔ اُف آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ اس نے مجھے جیسے ہی پہچان لیا اُس نے مجھے پکڑنا چاہا مگر میں نے اُسے دکھا دیا اور وہ زمین پہ گر پڑا۔ میں بھاگا اور اُس نے میرا پیچھا کیا۔ میں بھاگتے بھاگتے بازار پہنچ گیا۔ پاگل اور دو تین بندے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نے جیسے شہزاد کو دیکھا میں نے اپنے آپ کو اُس کے پاس پہنچایا۔ اب میں نے اطمنان کا سانس لیا کیونکہ میں اپنے علاقے میں تھا۔ اُن لوگوں نے جب شہزاد کو دیکھا اور شہزاد نے اُنہیں دیکھا تو وہ لوگ رک گئے۔ اُنہیں پتہ تھا کہ آگے ہمارا علاقہ ہے اور اُن کے لیے آگے آنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔

پاگل نے دانت بجاتے ہوئے کہا ''اس نے آج ایک بار پھر ہمارے حدود کو پار کیا ہے اسے میں نہیں چھوڑونگا''۔

شہزاد نے اطمینان سے جواب دیا ''آگے قدم بڑھا کے دیکھو شائد اُسے پکڑ سکو''۔

پاگل یہ سُن کے غصے سے لال ہو گیا اور کہا ''تمہیں یہ مہنگا پڑ سکتا ہے''۔

شہزاد نے ایک بار پھر اُسی انداز میں جواب دیا ''میں تمہیں نہیں روکتا جو کر سکتے ہو کر لو۔ مگر پچھلی بار کی طرح اس بار زندہ نہیں جاؤ گے''۔

شہزاد نے اُنہیں دکھانے کے لیے پستول نکال کر اُس کی نوک کو صاف کرنے کا ناٹک کیا۔ اُنہیں بھی پتہ چل گیا تھا کہ آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تب اُنہوں نے مُڑنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کے جانے کے بعد شہزاد تھوڑی دیر مجھے گھورتا رہا اور پھر اپنی پستول میرے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا۔

ابو اور تایا کے علاوہ گھر میں سب کو میری اس حرکت کا پتہ چل گیا تھا۔ سب پریشان تھے کہ آخر میرے ساتھ کیا کیا جائے۔ اتفاق اس بات پہ ہوا کہ ایبٹ آباد میں ایک گھر کرائے پہ لیا جائے، ویسے بھی مسعود، جواد، منصور بھائی وہاں ہوتے ہیں اور کچھ اور بھی چلے جائیں گے۔ اور مجھے زیادہ سے زیادہ وہاں پہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ محبت فاصلوں سے مٹتی نہیں اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں ایسا تھا کہ ہر کوئی ہم کو ایک دوسرے سے جُدا کرانے پہ تُلا ہوا تھا، کیوں دو بندوں کی خوشی کسی کو بھی گوارہ نہ تھی، کیوں چاہنے والوں پہ ہمیشہ ظلم ہوتا ہے۔

ایک طرف ثانیہ کی منگنی کرائی گئی تو دوسری طرف اُن کے خاندان والے میرے خون کے پیاسے ہیں، ایک طرف میں اُس سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں تو دوسری طرف میرے گھر والے اُس سے دور لے جا رہے تھے۔ کیوں اتنا سمجھدار ہو کر بھی نہ سمجھ بن جاتے ہیں، کیوں ہر چیز سے باخبر ہو کر بے خبر بن جاتے ہیں، کیوں پیار کرنے والوں کے لیے ظالم بن جاتے ہیں۔ میں اپنے دل کا حال کیسے بیان کروں میرے الفاظ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اُن کا بوجھ اُٹھا سکوں۔ تو میں ثانیہ کے دل کا حال کیسے بیان کروں جس نے مجھ سے زیادہ دُکھ سہے ہیں۔ کیوں اس دل کا علاج نہیں ہے، کیوں بے بس بنایا جاتا ہے محبت کرنے والوں کو، کیوں اپنی جھوٹی انا کی وجہ سے کئی زندگیاں برباد کی جاتی ہیں۔

میں ٹوٹ رہا تھا اور یہ دنیا مجھے توڑ رہی تھی، میں ڈوب رہا تھا اور لوگ نظارہ کر رہے تھے، میں جل رہا تھا اور سب اُس میں تیل چھڑک رہے تھے۔

میں لگ کے گلے یار کے رویا بہت

نظارہ کر کے لوگوں نے مزاق اُڑایا بہت

کانٹوں پہ چل پڑا تھا تلاش اُس کے

ایک پھول نہ ملا اور زخم ملے بہت

میں نے سدا ہنستے دیکھا تھا اُسے

وہ جب بھی روئی تو مجھے ساتھ رولایا بہت

نہ معاف کرا گر رگڑے ماتھ ساحر

ستایا ہے اُس نے میرے دلدار کو بہت

ہر رات وہ میرے خوابوں میں آتی تھی کہتی تھی کہ ''مجھے ان لوگوں سے چھڑاؤ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کسی کی بھی نہیں ہونگی''۔
ہر رات میں وعدہ کرتا تھا کہ میں اُسے چھڑا کے لے جاؤنگا لیکن دن کے اُجالے ہوتے ہی وہ وعدے ٹوٹ جاتے تھے۔ وہ روتی رہی، مگر کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ میں تڑپتا رہتا لیکن کوئی سمجھنے والا نہیں تھا۔ وہ مدد کے لیے پکارتی رہی، کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ میں درد سے کراہتا رہا، کوئی مرہم لگانے والا نہیں تھا۔ وہ بے آسرا تھی اُسے سہارے کی ضرورت تھی میں ہی تو اُس کا آسرا تھا اُسے میری ضرورت تھی۔ مگر کسی کو کیا پرواہ کہ ہم پہ کیا گزر رہی ہے۔
کچھ دنوں میں ایبٹ آباد میں گھر کرائے پہ لیا گیا اور گھر کے کچھ افراد کے ساتھ مجھے بھی وہاں لے گئے حالانکہ ابھی بہت چھٹیاں باقی تھیں۔ ہمارا گھر کاکول روڈ پہ تھا۔ آرمی کی جگہ تھی اس لیے بہت پیاری تھی اور صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ گھر پہ وقت گزرتا نہیں تھا اس لیے باہر گھومنے کے لیے نکل آتا تھا اور ٹانگوں میں جتنا دم ہوتا گھومتا رہتا تھا۔ میں کوشش کرتا کہ اُسے یاد نہ کروں لیکن پتہ چلتا کہ اُس کے سوا اور کچھ یاد نہیں۔ اُس سے رشتہ توڑنا چاہتا تھا لیکن اُس کے سوا کوئی اپنا نہیں تھا۔ سوچا اُسے زندگی سے جُدا کروں مگر یہ زندگی تو اُسی کی تھی۔ میں اُس کے خیالوں میں اتنا کھویا ہوتا تھا کہ کس راستے سے آیا اور کہا پہنچا یہ بھول جاتا تھا۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی جو کہ ایک اچھا دوست دے سکتا تھا۔ اس لیے میں ہاسٹل جلد سے جلد جانا چاہتا تھا۔

ایک دن مسعود بھائی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور بڑے پیار سے میری طبیعت پوچھی میں نے بھی اچھے انداز میں جواب دیا۔
پھر وہ کہنے لگے کہ ''ایسا کرتے ہیں کہ تمہیں ہاسٹل سے چھٹکارہ دلاتے ہیں''۔
میں کچھ پریشان ہوا کہ کیا وجہ ہے اور پوچھا ''جی! کیا مطلب؟''۔
وہ تفصیل میں بتانے لگے ''مطلب کہ اب ویسے بھی گھر ہے، گھر والے بھی ادھر ہیں تو ہاسٹل جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں سے آیا جایا کریں گا''۔
میں نے سوچا کہ ایک طرف ثانیہ سے الگ ہو گیا اب یہ لوگ مجھے اُن دوستوں سے بھی دور کرانا چاہتے ہیں جن کے ساتھ خوش رہنے لگا تھا۔ اس لیے میں نے انکار کیا اور جواز یہ پیش کیا کہ ''میں یہاں پڑھ نہیں پاؤنگا، ہاسٹل اچھا ہے وہاں پڑھائی اچھی طرح ہوتی ہے اور دوسری بات کہ میں وہاں خوش ہوں''۔
وہ مسکرا کر بولے ''ہم چاہتے تھے کہ تم یہاں گھر میں رہو لیکن اگر تمہاری خوشی ہاسٹل میں ہے تو تمہیں کوئی نہیں روکے گا''۔
میں نے بھائی کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے میری بات مان لی۔
وہ جانے لگے مگر پھر مُڑ کر بولے ''اور ہاں میں تم سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ جو سخت لہجہ یا سخت باتیں میں کرتا ہوں تمہارے بھلائی کے لیے کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری محبت کی بھی قدر ہے مگر کبھی کبھی چاہے ہوئے لوگ قسمت میں نہیں ہوتے''۔
'قسمت' پتہ نہیں یہ لفظ ہر وقت کیوں انسان کے چاہت کے بیچ آتا رہتا ہے۔ میری لاکھ کوشش کے باوجود کہ میں اپنے جذبات کا اظہار نہ کروں پھر بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
جو کہ بھائی نے دیکھ لیئے اس لیے محبت سے اُنہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا ''مجھے اپنے سامنے کمزور مت کرو''۔
اس لیے میں نے اپنے آنسو پونچے اور وہاں سے چلا گیا۔
اگلے دن مجھے ہاسٹل جانا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ وہاں دوست ہیں جن کے ساتھ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ ہاسٹل میں کچھ لڑکے آئے تھے اور کچھ کو کل صبح آنا تھا۔ جو آئے تھے اُن کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ سارے فریاد کر رہے تھے کہ جیل میں پھر آ گئے ہیں۔ حسن اور حسین سے بھی مُلاقات ہوئی۔ نعمان، شیخ اور شکیل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ حسن اور حسین

کے ساتھ خوب گپ شپ لگی اُنہوں نے چھٹیاں کہاں اور کیسے گزاری تھیں ایک ایک منٹ کا حال سُنا دیا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ میری چھٹیاں کیسے گزریں۔ میں نے سوچا کہ ان کو سچ سمجھ نہیں آئی گی اس لیے میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ سن کر خوش ہوتے گئے اور میں بھی اپنی باتوں سے لطف اُٹھا رہا تھا۔ رات تک اور بھی لڑکے آئے جن میں ایک شیخ بھی تھا اور شغل کا میلہ گرم ہونے لگا تھا۔ شیخ ہاسٹل آنے پہ خوش تھا اور جو خفہ ہوتا اُس کا مزاق اُڑاتا۔ کھانا کھانے کے بعد لڑکے سونے لگے تھے، سب سفر کر کے تھک گئے تھے۔

شیخ اور میں بیٹھ کر گپ لگا رہے تھے۔ باتوں باتوں کے دوران میں کچھ کھوسا جاتا تھا اس لیے شیخ سمجھ گیا۔

اُس نے پوچھا ''تو بتاؤ کون ہے وہ؟''

میں اُس کی بات کو سمجھا نہیں ''کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟''

اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو''۔

میں سمجھ گیا مگر اُس کو بتا نہیں سکتا تھا ''میں سوچ نہیں رہا ہوں، تم سے بات کر رہا ہوں''۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ''مجھے پتہ ہے بیٹا! تم باتیں تو کر رہے ہو مگر دہان کہیں اور ہے۔ اس لیے تو میں جو سوال پوچھتا ہوں اُس کا اُلٹ جواب ملتا ہے''۔

میں نے آنکھیں نیچے کیئے اور کہا ''جیسا تم سوچ رہے ہو، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس گھر کی تھوڑی سی یاد آ رہی ہے''۔

وہ تھوڑی دیر میری آنکھوں میں دیکھتا رہا اور پھر بولا ''مجھے یقین نہیں ہے کہ تم گھر کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ بلکہ ایسی بات ہے جو تم کسی کو نہیں کہنا چاہتے۔ اس لیے میں بھی بار بار پوچھ کر تنگ نہیں کرونگا''۔

اُس کے اس بات پہ میری خاموشی نے اُس کے شک کو یقین میں بدل دیا اور اُس نے خوبصورت مسکراہٹ دے کر اُس کا اظہار کیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ نیند میں خراٹے لینے لگا۔ مجھے بھی نیند آ گئی، میں بھی سو گیا۔

سکول جانا شروع ہو گیا۔ نعمان، شکیل، جمیل اور باقی دوست بھی آ گئے۔ دن گزرتے گئے، وہی لوگ، وہی چہرے، وہی روٹین۔ مگر میں خوش تھا، یہاں ہر کوئی دکھ میں شریک ہوتا تھا نہ کہ دکھ دیتے۔ یہاں ہر کوئی سہارہ بنتے نہ کہ سہارہ چھینتے۔ ہر کوئی آنسو پونچتے تھے نہ کہ دیتے۔ تو ایسی جگہ پہ میں خوش کیسے نہ ہوتا، جہاں پرائے اپنوں کے حقوق نبھارے تھے۔ اب میرے پاس وقت تھا کہ میں نعمان کے ساتھ وقت گزار سکوں۔ سکول کے دوران بریک میں اُس کے ساتھ ہوتا تھا، سٹڈی کے بعد ہم گراونڈ میں بیٹھتے تھے، شام کو ہم دونوں کینٹین جاتے تھے۔ وہ جلال جیسا ہی تھا، وہی باتیں، ویسا رویہ لیکن بدقسمتی سے سچ میں جلال نہیں تھا۔ میں جب اُس کے ساتھ ہوتا تھا مجھے یاد ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ نعمان ہے مجھے ایسا لگتا کہ یہ جلال ہے۔ اُس کے ساتھ ہوتا تو لگتا کہ میں واپس پرانے وقت میں چلا گیا ہوں اور ہم ویسے ہی بس میں سفر کر رہے ہیں۔ ہماری دوستی بہت اچھی تھی، وہ مجھ سے خوش تھا میں اُس سے۔ اُس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے لڑکے مجھ اُس کا عاشق بُلانے لگے۔ مجھے بُرا نہیں لگتا تھا کیونکہ لوگ تو کچھ بھی بول لیتے ہیں۔ میں نے یہ بات اُسے بتائی تو اُس نے بھی نظر انداز کیا۔ ہمیں کسی کی باتوں کی پرواہ نہیں تھی، جب نیت صاف ہو تو کیا پرواہ کوئی کیا کہیں۔

ہفتے اور اتوار کو فون ڈے ہوا کرتا تھا۔ ایک فون ڈے پہ مجھے بھی فون آیا مجھے بُلایا گیا۔ مجھے لگا گھر سے ہے کوئی خاص کام کے لیے کیا ہوگا۔ میں بیٹھ کر فون کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ منٹ بعد ایک فون آیا میرا نام پُکارا۔

میں نے فون کان سے لگایا اور کہا ''ہیلو!''۔

اُدھر سے احتشام کی آواز آئی ''ہیلو جی کیسے ہو؟''

احتشام کی آواز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ اس نے مجھے کیوں کال کی ہے۔ میں نے اُسے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگا ''ایک بہت اچھی خبر ہے۔ بتاؤنگا تو ناچنے لگو گے''۔

میں بے چین ہو کر پوچھنے لگا ''جلدی بتاؤ یار کافی وقت ہو گیا ہے کوئی خوش خبری نہیں سُنی ہے''۔

اُس نے کہا ''ثانیہ پھر سے سکول جانے لگی ہے اور میرے کزن کے ساتھ کلاس میں ہے۔ میرے کزن نے مجھے خود بتایا ہے''۔

میں خوشی سے اُچھلنے والا تھا مگر اپنے آپ پہ قابو پالیا۔ مگر ساتھ میں حیرانی بھی ہوئی کہ اُسے گھر والوں نے سکول کیسے جانے دیا۔ جب یہی میں نے اُس سے پوچھا تو کہا ''اُس کے منگیتر کو جب پتہ چل گیا کہ اُسے سکول نہیں جانے دیتے تو اُس نے کہا کہ میں ایک جاہل لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا اس لیے اُس نے یہ شرط رکھی کہ شادی تک اسے پڑھنے لکھنے دیا

جائے اُس کے بعد میری مرضی۔ایک ڈرائیور رکھا ہے جو اُسے اپنی گاڑی میں سکول لاتا، جاتا ہے۔اور۔۔۔۔'' ۔

میں نے اُس کے بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''کیا تمہاری کزن میری اُس سے بات کروا سکتی ہے؟''

وہ بولا ''میں یہی کہنے والا تھا کہ تم ایک موبائل رکھ لو اور جب چاہو میری کزن کو فون کر کے ثانیہ سے بات کر لیا کرو'' ۔

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آئے اور کہا ''احسان چُکائے جا سکتے ہیں مگر آج جو تم نے میرے لیے کیا ہے اس کا بدلہ شاید کہ میں چُکا پاؤ'' ۔

وہ مسکرا کر بولا ''میں نے یہ کام احسان سمجھ کے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کہ کیا ہے۔آخر ہم دوست ہیں یار۔مجھ سے اور جتنا بھی ہو سکے گا میں کرتا رہوں گا اور تم دونوں کے لیے دعا گو رہوں گا'' ۔

میں نے جواب میں بولا ''آج تمہاری اس باتوں نے بہت سہارہ دیا ہے ورنہ میں تو ٹوٹ چُکا تھا'' ۔

اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''بس اُداس مت ہونا دوست اور اپنا خیال رکھنا۔جلد بات ہو گی۔خدا حافظ'' ۔

''خدا حافظ'' ۔کہ کر میں نے بھی فون رکھ لیا۔

میں بہت خوش تھا کیونکہ بہت وقت کے بعد خوشی کا ایک جھونکا آیا تھا۔میں یہی دُعا کرتا رہا کہ یہی جھونکا ہمارے ملنے کا سبب بن جائے۔رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ثانیہ کو بھگا لے جا رہا ہوں۔ہم آگے ہیں اور اُس کے گھر والے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔بارش ہونے کی وجہ سے راستہ میں کیچڑ بنا ہوا تھا جس میں ثانیہ پھسل کر گر گئی۔اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور نہیں چل پا رہی تھی۔وہ لوگ قریب ہونے لگے تھے،میں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بھاگنے لگا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں زیادہ تیز بھاگتا۔کچھ دور جا کر میں بھی پھسل کر گر گیا اور وہ لوگ سر پہ آ کھڑے ہو گئے۔وہ ہمیں جُدا کرنے لگے مگر ہم نے ایک دوسرے کو مظبوطی سے پکڑا تھا۔اس لیے وہ مجھے مارنے لگے اور ہمیں جُدا کر دیا۔پاگل نے ثانیہ کو ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا ''تجھے تو بعد میں دیکھتا ہوں'' ۔

وہ میری طرف آیا اور میرے سر پہ پستول رکھ کر کہا ''میں نے کتنی بار تمہیں منع کیا کہ ہم سے پنگا مت لے۔اب لگا آواز دیکھتا ہوں کون آتا ہے تمہاری مدد کے لیے'' ۔

سب ہنس پڑے اور میں نے آنکھیں بند کر دیں۔گولی چلنے کے ساتھ ہی اچانک میں نیند سے اُٹھ گیا۔مجھ پہ خوف کی وجہ سے پسینہ آیا ہوا تھا مگر لڑکے مزے سے سو رہے تھے۔

میں پانی پینے کے لیے باہر آیا۔پانی پینے کے بعد میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔میں پریشان ہونے لگا تھا کیونکہ ایسے خواب میں اکثر دیکھنے لگا تھا۔میں کیا کرتا کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا جس سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے سارا بوجھ اس دل میں تھا تو ایسے خواب کو تو آنا ہی تھا۔

اگلے ہفتہ مسعود بھائی مجھے لینے آئے۔پرنسپل نگار سے چھٹی لی اور گھر گئے۔موبائل اور سیم خرید لیا۔احتشام کو فون کیا اور اُس سے اُس کے کزن کا نمبر لیا۔جب اُس سے بات ہوئی اُس نے اپنا نام بتایا'سارہ' اور سارا واقع اُس نے اپنے منہ سے بیان کیا اور کہا ''پیر کو سکول ٹائم مجھے کال کریں میں اُس سے بات کرواؤ نگی'' ۔

میں نے بے چین ہو کر پوچھا ''وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

وہ ہنس کے بولی ''ہاں! بالکل آپ اس کی فکر مت کریں جب بات ہو جائے گی خود پتہ چل جائے گا'' ۔

میں نے کہا ''میں اتنے لوگوں کا احسان لے رہا ہوں کہیں اس بوجھ تلے دب نہ جاؤ'' ۔

اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''آپ ہر چیز اپنے سر کیوں لیتے ہیں حالانکہ رشتہ وہی مضبوط ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے کے کام آئے۔مجھے آپ بھائی جیسے لگتے ہو اور میں دل سے چاہتی ہوں کہ آپ اور ثانیہ ایک ہو جاؤ'' ۔

میں نے کہا ''اگر بہن دعا کریگی تو اُمید ہے کہ خدا قبول کریگا'' ۔

اُس نے کہا ''کیوں نہیں،بس آپ خوش رہا کریں اور اپنا خیال رکھیں۔ثانیہ کی فکر بالکل نہ کریں اس کا خیال میرے ذمہ'' ۔

میں نے اعتماد کرتے ہوئے کہا ''شکریہ جی میں پیر کے دن فون کرونگا اب رکھتا ہوں۔خدا حافظ'' ۔

اتوار کی شام کو میں ہاسٹل واپس آیا دیکھا تو ہر باہر سے آنے والے کی تلاشی لی جا رہی تھی اور جس کے پاس کچھ غیر قانونی چیز نکل آتی تو اُس کی خوب دُھلائی کرتے اور وہ چیز بھی ضبط کر لیتے تھے۔میں نے موبائل جلدی سے انڈر ویئر میں ڈال دیا۔جب میری باری آئی،میری جیب،جرابیں وغیرہ کی تلاشی لی گئی جب کچھ نہ ملا تو اُس کا تھ میرے انڈر ویئر کی

طرف بڑھا تو میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''اگر اتنا شک ہے تو کہہ دے میں اُتار کے دکھاتا ہوں''۔

یہ سُن کر وہ ملامت ہوئے اور جانے کا کہا۔ رات کافی دیر تک تو گپ شپ لگی مگر جب سب سو گئے تو میں کل کا انتظار کرنے لگا۔ گھڑی نے اپنی رفتار دھیمی کر دی تھی، انتظار نے نیند کو آنکھوں سے چُھرا لیا تھا، محبت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا تھا۔ بیڈ میں کبھی ایک طرف سے دوسرے طرف، کبھی ایک سے دوسری کروٹ۔ اُس کی باتیں سُنائی دے رہی تھیں، اُس کا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا کہ کب جا کر صبح ہوگی مگر جیسے اس صبح کو بھی بلالؓ کی آذان کی ضرورت تھی مگر اب اُنہیں کہاں سے لاؤں۔ آخر رات تو گزر گئی لیکن ہر پل کو گزر جانے کی منتیں کر کے۔

صبح ناشتہ کیا اور سکول کے لیے تیار ہوا۔ ساری رات نیند نہ آنے کی وجہ سے میرا دماغ سویا سویا سا تھا اور آنکھیں لال ہو چکی تھیں۔ سب دیکھ کر کہتے تھے کہ چرس پی کر آئے ہو یا شراب جو آنکھیں لال ہیں اور نشے میں ہو۔ مگر اُنہیں کیا خبر کہ یہ عشق کا نشہ ہے۔ شیخ مزاق اُڑانے میں سب سے آگے تھا۔ وہ چرسیوں سی آواز میں بولا ''بھائی کتنے کلو پی کر آئے ہو جو ٹن ہو کر چل رہے ہو؟''

میں کسی کو جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی وہ بس کہتے رہے اور میں صرف سُنتا رہا۔ ہاسٹل میں موبائل پہ سختی کی وجہ سے ایسی جگہ ڈھونڈ نا تھی کہ جہاں مجھے بات کرتے کوئی نہ سُن سکے۔ مجھے خیال آیا کہ ہاسٹل میں جو انگلش باتھ روم ہیں اُسے کوئی استعمال نہیں کرتا اور اس وقت وہاں ویسے بھی کوئی نہیں ہوگا اس لیے میں آرام سے وہاں بات کر پاؤنگا۔ پہلے کلاس کے بعد میں ہاسٹل چُپ کے گیا۔ موبائل لیا اور باتھ روم گیا اور کال ملانے لگا۔ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا، میں کانپنے لگا۔ مجھ سے نمبر نہیں ملا نا ہوا، میں خوش تھا لیکن اتنے وقت کے بعد اُس سے بات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کیونکہ وہ سوال پوچھے گی اور جس کے جوابات میرے پاس نہیں ہے۔ اگر وہ رو پڑی تو میرے پاس اُس کو چُپ کرانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اور بہت سے عجیب و غریب سوال ذہن میں آ رہے تھے مگر اُس سے بات تو کرنی تھی اس لیے کال ملائی۔

سارہ بولی ''ہیلو!''۔

میں نے جواب دیا ''ہیلو جی''۔

وہ بولی ''میں صبح سے آپ کے فون کا انتظار کر رہی تھی اور تب سے ثانیہ کو اپنے پاس بٹھا کے رکھا ہے۔ وہ بہت بے چین ہے تم سے بات کرنے کے لیے۔ اُس کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے آپ لو اُس سے بات کریں''۔

ثانیہ نے موبائل لیا اور کہا ''ہیلو!''۔

اُس کے ہیلو کہتے ہی میرے پاؤں سے دم نکل گیا اور پھسل کر گر گیا اور منہ سے آواز آئی ''آوچ''۔ زور سے فرش پہ لگا تھا اس لیے اُٹھنا نہیں ہوا۔

اُس نے پوچھا ''کیا ہوا جی! گر گئے ہو کیا؟''

میں نے درد بھری آواز میں کہا ''ہاں نا یار''۔ میں نے پوری کہانی بتائی کہ میں باتھ روم سے بات کر رہا ہوں۔ تو وہ مجھ پہ خوب ہنسی اور میں بھی اُس کے ساتھ ہنس پڑا۔ کیا عجیب چیز ہے یہ محبت لاکھوں زخم دیتی ہے مگر محبوب کی ایک ہنسی وہ سب کچھ بُھلا دیتی ہے۔ وہ ہنستے ہنستے اچانک چپ ہو گئی اور پھر کہا ''قسم سے تم سے ملنے کے بعد پہلی بار ہنس رہی ہوں، ورنہ قسمت نے ہمیشہ آنسو اور درد دئے ہیں۔ تم نے مجھ سے محبت کر کے بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ تم نے جتنا سہا ہے وہ تمہارے اس محبت سے بہت زیادہ تھا۔ جو میرے ساتھ اُنہوں نے کیا میں نے سب معاف کیا ہے مگر جو تمہارے ساتھ کیا اُن میں سے کوء بھی ستم کبھی بھی معاف نہیں کرونگی اور جلال کی۔۔۔۔۔''۔

میں نے اُس کے بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''بس، خدا کے لیے بس کر واپنے اور میرے زخموں پہ نمک مت چھڑکو۔ اُنہوں نے جو کیا بُرا کیا۔ ہمارے ساتھ جو ہوا وہ بُرا ہوا مگر میں نے اُنہیں یاد کرنے کے لیے فون نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ تمہارا حال پوچھ سکوں، تمہاری آواز سن سکوں اور تم سے باتیں کر سکوں''۔

اُس نے معافی مانگتے ہوئے کہا ''غلطی ہو گئی جی، معاف کر دو۔ ائندہ ایسا نہیں ہوگا''۔

میں نے اُسے تنگ کرتے ہوئے کہا ''اگر میں معاف نہ کروں تو۔۔۔''۔

وہ مسکرا کر بولی ''میں کان پکڑ کر کہہ رہی ہوں بابا''۔

میں نے کہا ''ایک شرط پہ''۔

وہ بولی ''بول کے دیکھو جان سے نہ گزری تو کہنا''۔

میں نے سنجیدگی سے کہا ''اپنی ہنسی سُنا دو۔تا کہ یہ دل کے داغ دھل جائیں''۔

''بس۔۔۔''۔یہ کہ کر وہ ہنس پڑی۔اُس کی ہنسی میں کچھ عجیب سا نشہ تھا جو مجھے مدہوش کر دیتی تھی۔مجھے ایسا لگا کہ ہم ساتھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔

میں نے اُسے کہا ''تمہاری ہنسی سن کر میں ایسے پگلا ہوں جیسے دھوپ میں برف''۔

وہ بولی ''تو برف جی فریزر سے نہ نکلا کرو نا''۔یہ کہ کر وہ پھر سے ہنسنے لگی اور جس کے ساتھ میری بھی ہنسی نکل گئی۔

خوب ہنسنے کے بعد میں نے کہا ''دل کر رہا ہے اُڑ کے تمہارے پاس آجاؤں اور کس کہ کے تمہیں گلے سے لگا لوں''۔

وہ بولی ''ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں مگر اب ناممکن سا لگتا ہے۔یہ لوگ مجھے ایک پل کے لیے نظروں سے دور نہیں ہونے دیتے''۔

میں نے کہا ''دیواریں وہ کتنی بھی اُونچی کریں میرا حوصلہ وہ کم نہیں کر سکتے۔میں جب بھی گاؤں آیا میں ملنے کی کوشش کرونگا۔نہ پہلے انجام سے ڈرا تھا نہ اب ڈرونگا''۔

وہ کہنے لگی ''ڈر تو مجھے لگتا ہے کیونکہ مجھے تمہاری فکر رہتی ہے۔منگنی کے دن بھی مجھے پتہ لگ گیا تھا کہ ابو نے تمہیں دیکھ لیا۔اُس دن مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی،بعد میں امی نے بتایا کہ وہ آیا تھا مگر چچا کے ہاتھ سے نکل گیا۔تب مجھے جا کر چین آیا''۔

میں ہنسا اور کہا ''ہاں!اُس دن میں بال بال بچ گیا تھا۔اُس دن تم بہت پیاری لگ رہی تھی میرا دل دیکھ دیکھ کے نہیں بھر رہا تھا''۔

وہ شرمائی اور کہا ''واقعی؟دیکھنا ایک دن تمہارے لیے بھی ایسی سجونگی۔پھر جی بھر کے دیکھنا''۔

اُس نے میرے منہ کی بات چھین لی تھی مگر اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔بس اتنا کہ پایا ''انشاللہ''۔

کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔اُسے ٹیچر نے بُلا لیا اس لیے اُسے جانا پڑا۔میری ایک کلاس ضائع ہوگئی تھی لیکن کسی کو پتہ نہیں چلا۔اُس سے بات کر کے اُس دن میں بہت خوش تھا۔شام کو سب دوستوں کو نیچے کینٹین پہ لے گیا اور ٹریٹ دی۔

شیخ نے کہا ''کیوں بھائی منگنی ہوگئی کیا جو ہم سب کو ٹریٹ دے رہے ہو''۔

میں نے جواب میں کہا ''شاید منگنی پہ بھی اتنا خوش نہ ہو پاؤں''۔

شکیل نے شیخ کے کان میں کچھ کہا اور ہنسنے لگا اور کہنے لگا ''شکیل کہ رہا ہے بھائی ہوا ہے کیا؟''

اُس کا یہ کہنا تھا کہ سب ہنسنے لگے اور میں مزاق میں شکیل پہ چپٹ پڑا کہ حرامی نے ایسی بات کہی تھی۔شیخ نے اُسے چھڑایا اور کہا ''اگر ایسی بات نہیں ہے تو خود بتا دے کہ کیا بات ہے جو اتنے خوش خوش لگ رہے ہو۔نہ آج فون ڈے ہے،نہ تمہارے گھر سے کوئی ملنے آیا ہے یہ خوش خبری ملی کہاں سے''۔

میں نے کہا ''سمجھو وحی آئی ہے۔تم آم کھاؤ پیڑ کیوں گن رہے ہو؟''

شکیل نے بیچ میں ٹانگ لڑاتے ہوئے کہا ''مگر پتہ تو کرنا چاہئے نہ کہ آم کہاں کے ہیں''۔

حسن بولا ''یہ آم بہت میٹھے لگ رہے ہیں شاید ملتان کے ہیں''۔

سب ہنس رہے تھے۔میں نے کہا ''میں نے غلطی کی جو تم لوگوں کو ٹریٹ دی۔تم لوگ اس قابل نہیں ہو جنہیں کوئی کچھ کھلائے''۔

شیخ نے اپنا آدھا پیا ہوا پیپسی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ تمہاری ٹریٹ مجھے نہیں چاہئے۔ایسا کہ رہا ہے جیسے احسان کر رہا ہو''۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سچ میں دے رہا ہے یا ناٹک کر رہا ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر لینا چاہا تو اُس نے ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا ''تم تو سچ میں لینے لگے ہو بڑے بے غیرت ہو۔میں نے سوچا تم غیرت میں آجاؤ گے اور کچھ اور بھی لے آؤ گے''۔

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''تمہارے ساتھ رہ کر میں نے بھی کچھ سیکھ لیا ہے۔اب اس کے بعد مجھ سے کچھ کھا کے دکھاؤ''۔

نعمان چُپ بیٹھ کر ہماری باتیں سن رہا تھا اور اُس وقت کچھ نہ بولا۔جب سارے اُوپر چلے گئے تب اُس نے مجھ سے پوچھا ''تو اب بتاؤ کہ کیا ہوا ہے جو کہ اتنے خوش ہو اور کسی کو بتانا نہیں چاہتے۔کیا میں اس قابل ہوں کہ مجھے بتایا جائے؟''

میں نے بات بناتے ہوئے کہا کہ ''کزن کی شادی میں ایک لڑکی پسند آئی تھی آج اُس سے فون پہ بات ہوئی ہے اس لیے میں اتنا خوش ہوں۔لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہاں کسی کو پتہ چلے اس لیے میں نے کسی سے نہیں کہا''۔

وہ کہنے لگا ''مجھے بھی لگا تھا کہ ایسی ہی بات ہے۔تمہاری آنکھوں سے خوشی کی کرنیں جو نکل رہی ہیں''۔

میں نے مسکرا کر کہا ''مجھ پتہ تھا کہ تم میری بات کو سمجھ سکتے ہو اس لیے تو تمہیں کہ دیا۔چلو اُوپر چلتے ہیں کہیں وہ لوگ پھر نہ آ جائیں''۔

شام کو میں اپنی یادوں والی جگہ بیٹھ کر یادیں تازہ کرر ہا تھا۔آج میں خوش تھا اس لیے بس وہ اور اُس کی ہنسی یاد آ رہی تھی۔میں ہر روز اُس سے بات نہیں کر سکتا تھا نہ ہر روز موقع مل سکتا تھا۔تقریباً ایک ہفتہ بعد اُس سے بات ہوئی۔وہ خوش تھی اس لیے میں بھی خوش تھا اور وقت اچھا گزر رہا تھا۔۱۴ اگست کی چھٹی کو ملا کر ہمارے لیے ایک لانگ ویکنڈ بنا دیا گیا۔میں نے گاؤں جانے کا منصوبہ بنایا۔جب تک بھائی کو چھٹیوں کا پتا چلے گا میں گاؤں پہنچ گیا ہونگا۔لیکن وہ میری سوچ سے تیز نکلے اور چھٹیوں سے ایک دن پہلے مجھ سے ملنے آئے۔وہاں سے اُنہیں پتہ چل گیا کہ چھٹیاں ہونے والی ہیں۔

مجھ سے کہنے لگے ''تم نے یہ چھٹیاں میرے ساتھ گزرانی ہیں،سب گاؤں گئے ہیں اور میں یہاں اکیلا ہوں اس لیے یہ کچھ دن میرے ساتھ رہو گے''۔

مگر میں نے گاؤں جانے کا کہا ''مجھے گاؤں جانا ہے مجھے سب کی یاد آئی ہے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے گاؤں سے آئے ہوئے''۔

لیکن وہ چھوڑنے والے نہیں تھے کہا ''یہ یاد بہت بُری چیز ہے کسی کو کچھ اچھا نہیں کرنے دیتی اور اگر اُن کی یاد سچ میں آ رہی ہے تو وہ لوگ اتوار کو واپس آ ئیں گے مل لینا۔یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی''۔

میں بھی اپنی بات پہ ڈٹا رہا ''میں تنگ ہو گیا ہوں ایبٹ آباد میں،میں ان چھٹیوں میں گاؤں جانا چاہتا ہوں۔اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں،گھومنا چاہتا ہوں''۔

اُنہوں نے کہا ''لوگ ہر جگہ سے یہاں گھومنے آتے ہیں۔تمہیں جو جگہ پسند ہو میں تمہیں وہاں لے جاؤنگا''۔

میں جذباتی ہو کر بولا ''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو گاؤں جانے والی ہر بات پہ اعتراض کیوں ہے؟''

وہ غصہ ہوتے ہوئے بولے ''کیونکہ وہ لوگ تیری جان لینے پہ تُلے ہوئے ہیں۔وہ تمہیں کہیں بھی دیکھ کر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسا ہونے دوں؟''

میں غم وغصہ میں بولا ''تو آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی ساری زندگی اُن کے ڈر سے یہاں ہاسٹل میں قیدیوں سی گزاروں۔تاکہ بعد میں لوگ بھی تعنے دیں کہ بزدل تھا اس لیے گاؤں آنے کی ہمت نہ کر سکا''۔

میری ہر بات پہ اُنہوں نے نہ کہنے کی قسم کھائی تھی کہا ''کیا تکلیف ہے تمہیں یہاں پہ اور میں نے پرنسپل سے بات کر لی ہے تم ہر دوسرے ہفتہ گھر آ سکتے ہو۔اتنے اچھے دوست،گھر ،ماحول،موسم،جہاں چاہو گھومنے جاؤ۔کیا یہ سب کچھ ہے گاؤں میں؟اور لوگوں کی فکر مت کرواُن کی تو عادت ہے باتیں کرنے کی۔بس تم اپنی پڑھائی پہ دھان دو''۔

مجھے اُن کو سمجھانا تھا ''مجھے اِن چیزوں سے کچھ نہیں لینا دینا مجھے تو گاؤں جانا ہے''۔

وہ نہیں ماننے والے تھے ''کیا تم نے سُنا نہیں کہ میں نے کیا کہا کہ گاؤں نہیں جانا تو نہیں جانا۔کل چھٹی ہوتے ہی گھر آ جانا اور اگر گاؤں جانے کی کوشش کی تو میں سمجھونگا کہ تم میرے بھائی ہو ہی نہیں۔یہ لو گھر کی چابی میں لیٹ آؤنگا تم گھر میں ہی رہنا۔(گلے لگتے ہوئے) مجھے کہیں پہ جانا ہے کل ملتے ہیں خدا حافظ''۔

میری اُمیدوں پہ پانی پھیر کر بھائی تو چلے گئے مگر مجھے پھر امتحان میں ڈال کے چلے گئے۔ایک طرف بھائی کا اصرار کہ رک جاؤ،دوسری طرف پیار کی پکار کہ آ جاؤ۔ایک طرف جانے پہ بھائی اپنے رشتے سے دستبردار کر رہے تھے،دوسری طرف نہ جانے پہ میرے وعدے ٹوٹ رہے تھے۔آخر دل پہ پتھر رکھ کر میں نے رکنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن سب خوشی خوشی گھر جا رہے تھے۔میرا چہرا اُترا ہوا تھا۔

شیخ آیا میرے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا ''زندگی میں دو پل بہت خوشی کے ہوتے ہیں ایک جب بہت دنوں بعد گھر جا رہے ہو اور پھر ایسے قید خانے سے اور دوسرا جب اپنے معشوق سے ملاقات ہو تب''۔

میں نے افسردگی میں کہا ''ان دنوں میں میرے لیے ایک بھی نہیں ہے۔نہ میں گھر جا سکتا ہوں نہ کسی سے مل سکتا ہوں''۔

وہ میری سنجیدگی دیکھ کے بولا ''کیوں جی آج خفا خفا لگ رہے ہو۔سنجیدہ باتیں کر رہے ہو کیا ہوا ہے کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟''

میرے دل پہ بوجھ تھا اور جلال کے بعد کوئی ایسا دوست ابھی بنا نہیں تھا کہ جس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ اس لیے میں نے کچھ اشاروں میں وہ بات کہہ دی ''ہاں یار بھائی نے گاؤں جانے سے منع کیا ہے، کہتے ہیں کہ گاؤں کا ماحول ٹھیک نہیں ہے۔ اب تم بتاؤ جہاں بچپن سے رہا، جہاں میری زندگی کی یادیں ہے، جہاں میرے اپنے ہیں، جہاں میری چاہت ہے مجھے وہاں جانے سے منع کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہاں گھر کس لیے لیا ہے۔ کیا طوطا پنجرے میں خوش رہ سکتا ہے؟''

شیخ کچھ دیر چپ رہا اور پھر ہنس کہ جواب دیا ''نظر تو ایسے آرہا ہے جیسے وہ ٹھیک نہیں کر رہے مگر کیا کسی کے گھر والے اُس پہ ظلم کریں گے؟ ہرگز نہیں اُنہوں نے بھی کچھ سوچا ہوگا کہ کیوں تمہیں یہاں رکھے؟''

زندگی میں پہلی بار اُس نے کبھی اچھی بات کہی تھی لیکن پھر بھی مجھے اچھی نہیں لگی اور میں جواب میں بولا ''جب کسی کے گھر والے اُس کے دل کی باتیں جان نہ سکیں، اُس کی سسکیاں سن نہ سکے، آنکھوں میں آنسو دیکھ نہ سکے تو ایسے لوگ کیا بھلا چاہیں گے، میرا کیا خیال رکھیں گے، کیوں ہر کوئی میری خوشی کے پیچھے پڑا ہوا ہے کیوں مجھے اپنے حال پہ نہیں چھوڑتے؟

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا ''تمہاری آنکھوں میں درد اور بے قراری میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں مگر میں وجہ دیکھ نہیں پایا''۔

میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''وجہ جان کر کیا کرلو گے؟ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا''۔

میں نے اسے اپنی لکھی یہ غزل سنائی۔۔۔۔

میرے نصیب میں ہی لکھا تھا درد تو کیا کرتا

بدن وقت کے آریوں سے کٹ رہا تھا تو کیا کرتا

میں بوجھ بن چُکا تھا سمندر کی لہر پہ

ڈبویا خود کی خواہشوں نے تو کیا کرتا

محبت کر تو لیتا ہے دل اپنی خوشی کے لیے

یہ آگ نہ بجی میرے لہو سے تو کیا کرتا

میں بازی دل کی جیت کر بھی ہارتا چلا گیا

واسطہ رہا میرا اپنی قسمت سے تو کیا کرتا

نام نہ آیا دربار عالیشاں میں کسی ظالم کا ساحؔر

مجھے لوٹتے رہے لوگ اپنے گھر کے تو کیا کرتا

وہ غزل سن کر اور بھی پریشان ہوگیا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باقی لڑکے کمرے میں آگئے اور ہمارے اس عنوان کو ادھورے موڑ پہ ختم کر دیا۔ سب چھٹیاں ملنے پہ خوش تھے سوائے میرے۔ اپنا سامان پیک کر کے باری باری ایک ایک گلے لگ کے چلے گئے۔

نعمان بھی آیا کہنے لگا ''آج تمہارا چہرا اُترا ہوا ہے۔ لگتا ہے گھر نہیں جا رہے ہو؟''

میں بولا ''ہاں یار گاؤں جانے کی اجازت نہیں ہے''۔

اُس نے مسکرا کر کہا ''کوئی بات نہیں میرے ساتھ میرے گاؤں چلو۔ یہ تین دن وہاں گزاریں گے۔ خوب مزہ آئے گا''۔

مجھے یہ بات بہت اچھی لگی مگر مجھے مسعود بھائی کا پتہ تھا ''ضرور جاتا لیکن میرے بھائی ایسا نہیں چاہیں گے''۔

وہ گلے لگا اور کہنے لگا ''اگلی بار میں اُن سے اجازت لونگا اور ہم ہمارے گاؤں جائیں گے۔ ہمارا گاؤں اتنا خوبصورت ہے کہ تمہارا واپس آنے کو دل نہیں کرے گا''۔

وہ جانے لگا میں نے کہا ''پھر تو میں اگلی بار ضرور جاؤنگا۔ خدا حافظ''۔

میں ہاسٹل سے سیدھا گھر گیا جو کہ سنسان پڑا تھا۔ تکیہ لگا کے ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔ چینل بدلے مگر کوئی ڈھنگ کا پروگرام نہیں ملا اس لیے بازار نکل آیا۔ دل اُداس تھا اس لیے کسی چیز کا مزا نہیں آرہا تھا۔ واپس گھر آیا اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ کام ڈھونڈنے لگا۔ گھر میں ایک طرف پھول پودے لگے ہوئے تھے جنہیں کئی دن سے پانی نہیں دیا گیا

تھا وہ مرجھانے لگے تھے میں نے اُن کو پانی دیا اور ہاتھوں سے اضافی جڑی بوٹیاں نکالنے لگا۔اسی دوران گھر کی گھنٹی بجی۔میں نے ہاتھ دھونے کی زحمت نہ کی اور دروازہ کھول دیا۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی چاول کی پلیٹ لیئے کھڑی تھی۔

اس نے پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا ''ہم آپ کے پڑوسی ہیں،آج ہم نے خیرات کی ہے تو امی نے کہا کہ آپ لوگوں کو چاول دے آؤں''۔

میں نے اپنے ہاتھ دیکھاتے ہوئے کہا ''میں تو اس کو لینے سے رہا آپ مہربانی کر کے اسے زرہ کچن میں رکھ لے''۔

وہ اندر آئی میں نے کچن دکھایا اس سے جا کر چاول وہاں رکھ دیے۔اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا تو مجھ سے پوچھا ''باقی گھر والے کہاں ہیں؟''

میں نے کہا ''اس وقت میں اکیلا ہوں گھر والے گاؤں گئے ہوئے ہیں''۔

وہ بولی ''پچھلی بار جب میں آئی تھی تو آپ نہیں تھے۔آج آپ ہے وہ نہیں ہیں''۔

میں مسکرایا اور بولا ''ہاں دراصل میں ہاسٹل میں ہوتا ہوں دو ہفتے بعد آتا ہوں''۔

کہنے لگی ''اچھا میں چلتی ہوں ایک دوست کے ہاں بھی چاول لے کے جانے ہیں''۔

وہ چلی گئی،میں نے پودوں کا کام ختم کر کے چاول کھائے کافی مزے کے تھے۔شام تک بھائی بھی آ گئے،رات کے کھانے کا انتظام اُنہوں نے کر لیا۔

بھائی پوچھنے لگے ''دن کیسے گزرہ؟ باہر گئے کہ بس گھر میں بیٹھے رہے؟''

میں نے جواب میں کہا ''دل لگنے کی بات ہے میرا دل وہاں لگتا ہے جہاں تنہائی ہو۔بازار کے شور سے میرے سر میں درد ہوتا ہے''۔

اُنہوں نے کہا ''اس دنیا کا سامنا کرنا سیکھ،اس سے پیٹھ نہ پھیر''۔

ابھی تک میرا غصہ ٹھنڈا نہیں تھا ''یہاں ہر ساتھ نبھانے والا ساتھ چھوڑ جاتا ہے،ہر اپنا پرایا ہو جاتا ہے،ہر دوست دشمن بن جاتا ہے۔مجھے تو اپنے گھر والوں سے یہ سبق ملا ہے کہ سخت وقت میں سگے بھی ساتھ نہیں دیتے''۔

وہ میری بات سن کر سُرخ ہو گئے کہا ''کیا تم مجھ پہ تنز کر رہے ہو؟''

میں نے کہا ''اس میں تنذ کی کیا بات ہے میں تو صاف کہہ رہا ہوں''۔

وہ غصے سے بولے ''لگتا ہے تم بھول گئے ہو کہ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں''۔

میرے دل پہ بوجھ تھا بس بول ڈالا ''کاش میں یہ بھول جاتا تو آج میں گاؤں میں ہوتا''۔

یہ کہہ کر میں روانہ ہوا وہ کہنے لگے ''تمہارے لیے جتنی قربانیاں میں نے دی ہے اور کسی نے نہیں دی ہے۔جب بھی تم ایسی تنذ والی باتیں کرتے ہو مجھے لگتا ہے کہ میری قربانیاں ضائع گئی''۔

یہ سن کر میں نے اپنے قدم روک لئے وہ کہتے رہے ''اس گود میں کھیلے ہو تم،انہی ہاتھوں پہ سوئے ہوئے ہو،انہی ہاتھوں سے کھائے ہوئے ہو،انہی کندھوں پہ گھومے ہو۔ابو نے اتنا پیار نہیں دیا جتنا میں نے دیا۔تمہارے تکلیف پہ تم سے زیادہ مجھے تکلیف ہوئی۔جو میں دکھا نہیں سکا اور تم محسوس نہیں کر سکے''۔

میں کمرے میں گیا اور دروازہ بند کر دیا۔اور کسی چیز پہ تو زور نہیں چل رہا تھا اس لیے رو پڑا خوب رویا،کچھ دنوں سے جو میرے اندر درد چُھپا تھا اُس نے سب مل کر مجھے رونے پہ مجبور کیا۔جس سے میرے دل کا کافی بوجھ کم ہو گیا۔بھائی نے دروازے پہ دستک دی کہ ''کھانا تیار ہے آجاؤ''۔

منہ ہاتھ دھو لئے۔میرا دل نہیں کر رہا تھا مگر اُن کو اور خفہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اُن کا دل رکھنے کے لیے چلا گیا۔سر جھکائے کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بولے ''تم کیا سمجھتے ہو کہ منہ ہاتھ دھو کر،آنکھیں نیچے کر کے تمہارے آنسو چھپ جائیں گے،نہیں۔میں تمہاری آنسوں کی بوّ کو پہچانتا ہوں۔(میں کچھ نہ بولا)۔میں تمہارے گلہ کرنے سے خوش ہوتا ہوں کیونکہ اس کے جواب میں،میں وہ باتیں بھی کہہ سکتا ہوں جو اس سے پہلے نہیں کہہ پاتا''۔

میں نے دبی آواز میں کہا ''دل پہ اتنا بوجھ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کچھ سمجھ نہیں آتا کہاں کیا بولنا ہے''۔

وہ مسکرا کہ بولے ''کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے''۔

میں اُٹھا اور اُن کے گلے لگ گیا۔ وہ ہنسنے لگے اور میرے دل کو بہت سکون ملا۔ کھانا کھانے کے بعد بھائی جلدی سو گئے میں دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا۔ اگلے روز بھائی کسی کام کے لیے چلے گئے اور میرا کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے بس ٹی وی دیکھتا رہا۔ ناشتہ کرنے کے باوجود بھوک لگی تھی لیکن فلم کو بیچ میں چھوڑ کے جانے والا نہیں تھا۔ فلم ختم ہونے والی تھی کہ کسی نے گھنٹی بجائی نہ چاہتے ہوئے دروازہ کھولنے چلا گیا۔ دیکھا تو وہی کل والی لڑکی جو چاول لائی تھی کھانا لئے کھڑی ہے کہنے لگی ''مجھے پتہ تھا کہ تم آج بھی گھر میں اکیلے ہو تو میں کھانا لے آئی۔ میں نے خود پکایا ہے''۔

وہ مجھے بہت پیار سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے کھانا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو کہا ''نہیں میں خود کچن میں لے کر جاتی ہوں''۔

اور بغیر اجازت کے گھر میں گھس گئی۔ کھانا کچن میں رکھا اور میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''میں کرن، آپ کا نام؟''

میں نے اپنا نام بتایا تو کہنے لگی ''بہت اچھا لگا آپ سے دوبارہ مل کر۔ آپ جب بھی ہاسٹل سے آئیں گے میں آپ سے ملنے آؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں ابو گھر پہ ہیں زیادہ دیر یہاں نہیں گزار سکتی''۔

وہ گئی تو میں نے دو باتوں پہ شکر ادا کیا۔ ایک کہ اس کے موجودگی میں بھائی نہیں آئے اور دوسری بات یہ کہ مجھے گھر بیٹھے بیٹھے کھانا مل گیا۔ کچھ دیر میں بھائی گھر آئے اور اُن کے بعد گھر والے بھی گاؤں سے آ گئے۔ ایک دن اُن کے ساتھ گزارا اور پھر واپس ہاسٹل آ گیا۔ چھٹیوں کی وجہ سے ثانیہ سے بات نہیں ہو پائی تھی اس لیے اُس سے بات کرنے کا دل کر رہا تھا۔ پیر کے دن صبح میں الماری میں بیٹھ گیا اور شیخ سے کہا کہ ''اسے باہر سے بند کر دو اور کچھ دیر بعد آ کر کھول لو''۔ میں نے سارہ کو فون کیا اُس نے ثانیہ کو فون دیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ باتوں کے دوران میری الماری کُھل گئی میں نے سوچا شیخ ہے مگر سینئر پراکٹر تھا اور اُس کے ساتھ زاہد شاہ صاحب تھے۔ اُس پراکٹر نے مجھے بات کرتے سن لیا تھا اور ٹیچر سے جا کر کہہ دیا تھا۔ مجھ سے موبائل ضبط کر لیا گیا اور پرنسپل کے پاس لے جایا گیا۔ وہ کافی غصہ ہوئے اور مجھے دو ہزار روپے جرمانہ کر دیا۔ پرنسپل نے میرے گھر والوں تک بات نہیں پہنچائی ورنہ اور بھی مسلہ بن جاتا۔ مجھے موبائل یا جرمانے کی فکر نہیں تھی بس گھر والوں کو پتہ نہیں چلا اس بات پہ خوش تھا۔

میں نے سوچا کہ اس معاملے کو ذرا ٹھنڈا ہونے دوں تب دوسرا موبائل خریدلوں گا۔ نگار صاحب مجھ پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ دو ہفتے بعد میں گھر گیا، کرن بہانے بہانے سے گھر چکر لگاتی تھی۔ مجھے پتہ لگ گیا تھا کہ میں اُسے پسند آ گیا ہوں۔ مگر میں نے اُسے ایسی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میرے گھر والوں کی وجہ سے وہ مجھ سے بات نہیں کر پاتی تھی لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی تھی۔ مجھے اُس کے چکر میں نہیں پڑنا تھا اگر گھر میں کسی کو پتہ چل جاتا تو کیا کہتے کہ ایک کی وجہ سے تو ایبٹ آباد آ گئے ہیں اور میں یہاں بھی ویسا ہوں۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پیچھا نہیں چھوڑنے والی۔ ہاسٹل داخل ہوا تو نگار صاحب کھڑے تھے مجھے لگا وہ اب میری تلاشی لیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا وہ مشکوک آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر کچھ کہا نہیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ نگار صاحب نے بھی مجھ پہ نظر رکھنا چھوڑ دی۔ اس لیے جب میں دوبارہ گھر گیا تو میں نے موبائل خرید لیا۔ کرن تب بھی آتی رہی مگر گھر والوں کی وجہ سے مل نہ پاتی تھی۔ میں نے موبائل الماری میں چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ پیر کو بات نہیں ہو پائی، اُسی دن شام کو ہم نیچے کرکٹ کھیل رہے تھے اور جب میں اُوپر آیا تو میری الماری کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا سامان دیکھا باقی سب کچھ تھا سوائے موبائل کے۔ مجھے کسی نے موبائل رکھتے ہوئے دکھ لیا تھا۔ شیخ لوگ بھی آئے اُنہیں بھی پتہ چل گیا اُس کو ایک لڑکے پہ شک تھا ''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اُسی کا کام ہے''۔

میں نے کہا ''شک کے بنا پہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم اُسے کیا کہیں گے کہ تم نے موبائل چوری کی ہے دے دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اُس نے کسی ٹیچر سے کہا تو میرے لیے مصیبت بن جائے گی جو کہ میں نہیں چاہتا''۔

شکیل نے کہا ''اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بات کسی ٹیچر تک نہ پہنچے تو اس کو یہی دفن کر دو اور موبائل ذہن سے نکال دو''۔

میں پریشان بیٹھ گیا اور کہا ''شکیل نے ٹھیک کہا ہمیں یہ بات یہاں دفن کرنی چاہئے''۔

شیخ بولا ''نہیں ہمیں اُس لڑکے کی تلاشی لینی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس ہی کے پاس ہے''۔

شکیل نے پوچھا ''فرض کر لو کہ ہم تمہاری بات پہ اتفاق کر لیتے ہیں پھر بھی تم اُس کی تلاشی کیسے لو گے؟''

شیخ نے جواب دیا ''تم اُس کی فکر مت کرو میں اُس کا انتظام کرتا ہوں''۔

سینئر پراکٹر میں سے ایک پراکٹر اُس کا اچھا دوست تھا اس لیے شیخ نے اُس پراکٹر سے کہا کہ اُس لڑکے کی تلاشی لے۔

تلاشی لی گئی کچھ برامد نہیں ہوا اور بات پرنسپل تک پہنچ گئی۔ اُنہوں نے کہا کہ ''میں تمہارے گھر والوں کو بُلا رہا ہوں کہ وہ لوگ تمہیں موبائل کیوں دیتے ہیں؟''

میں نے کہا کہ ''یہ میں اُن سے بھی چُھپا کہ رکھتا ہوں اُن کو پتہ چل گیا تو وہ بھی غصہ ہونگے آپ مہربانی کر کے اُنہیں مت بتانا آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا''۔

وہ نہیں مان رہے تھے، میری لاکھ منتوں کے بعد کہیں جا کر بات اس پہ بنی کہ اگر پھر ایسا ہوا تو میرے گھر والوں کو بُلایا جائے گا۔ اس معاملے میں بھی میں بال بال بچ گیا۔ میرے لیے ثانیہ سے بات کرنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ میں بہت پریشان تھا کہ اب کیا ہوگا۔

اگلے ہفتے مجھے گھر جانے کی اجازت ملی۔ گھر والے گاؤں گئے ہوئے تھے میں ایک بار پھر گھر میں اکیلا تھا۔ بھائی اپنے کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ کرن نے گھنٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا تو مسکرا کہ سلام کیا اور کہا ''میں کھانا لائی ہوں''۔

وہ کچن گئی کھانے کو پلیٹ میں ڈال کر میز پہ رکھا اور مجھے کہا ''آؤ! کھانا کھالو''۔

میں اتنی دیر تک کچھ بول نہ پایا اور وہ کھانا کھلانے تک آ گئی تھی۔ میں کھانے کے لیے بیٹھ گیا اور وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں اُس کے سامنے کھانا نہیں کھا سکتا تھا لیکن اُسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی وہ بس مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ویسے ہی بیٹھا رہا نہ وہ کچھ بولی نہ میں کچھ بول پایا۔

جب اُسے احساس ہوا کہ میں کھانا نہیں کھا رہا ہوں تو بولی ''لگتا ہے تمہیں شرم آ رہی ہے اس لیے کھانا نہیں کھا رہے ہو؟ میں کھلاؤ؟''

ایسے پیار سے بولی جیسے ماں اپنے پانچ سالہ بچے سے کہتی ہے۔

میں نے کہا ''نہیں ایسی بات نہیں لیکن کبھی پرائی لڑکی کے سامنے کھانا نہیں کھایا ہے''۔

''آج کھالو!''۔ یہ کہتے ہی اُس نے ایک بڑا نوالہ لے کر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ اے لو یہ اس نے کیا کر دیا۔ اتنا بڑا نوالہ تھا کہ نہ نگل سکتا تھا نہ نکال سکتا تھا۔ اُگلتا تو اُس کی بے عزتی تھی اور نگلتا تو میری۔ اتنے پیار سے نوالہ دیا تھا کہیں خفہ نہ ہو جائے اس لیے نگل لیا۔ اُس کے بعد ایک اور، ایک کے بعد دوسرا نوالہ، وہ دیتی رہی اور میں بن چبائے نگل رہا تھا۔ میرا معدہ جواب دینے والا تھا۔ میں اُسے روک نہیں پایا لیکن جب گھنٹی بجی تو مجبوراً اُسے روک دیا۔ اور میرے منہ سے ایک دم نکلا کہ ''بھائی؟''

وہ اُٹھ کہ دروازے کی طرف جانے لگی تھی میں نے ہاتھ سے پکڑ کر روکا کہ ''پاگل ہو گئی ہو کیا گیٹ پہ بھائی ہے دیکھے گا تو گڑ بڑ ہو جائے گی۔ اس لیے تم۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ''

میں اُسے اپنے کمرے کے باتھ روم میں لے گیا اور اُسے کہا ''جب تک میں نہ آؤ یہاں سے ہلنا مت''۔

گھنٹی دوبارہ بجی اور میں بھاگ کے گیا تو واقعی بھائی تھے۔ اندر آتے ہی اُن کی نظر لاونج میں کھانے پہ پڑی کہا ''کھانا کھالیا؟ میں تو تمہارے لیے برگر لایا ہوں''۔

میں نے کہا ''ہاں! وہ سامنے والے گھر کی آنٹی نے بھیجا ہے''۔

وہ کہنے لگے ''چلو اچھا ہے (برگر دیتے ہوئے) یہ لو بعد میں گرم کر کے کھا لینا''۔

برگر لیتے ہوئے ''جی اچھا''۔ برگر کچن میں رکھا اور کمرے میں جانے لگا تو باتھ روم سے پانی بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو آواز بھائی کو بھی سنائی دی۔

اُنہوں نے فوراً پوچھا ''تمہارے باتھ روم میں کون ہے؟''

میں نے جواب دیا ''کوئی نہیں۔ میں باتھ روم میں تھا جب آپ نے گھنٹی بجائی تو پانی مجھ سے کھلا رہ گیا تھا''۔

کہنے لگے ''آئندہ خیال رکھنا۔ پانی ضائع مت کرو''۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور باتھ روم گیا تو وہاں کرن نلکا کھول کر پانی سے کھیل رہی تھی۔

میں نے دھیمی آواز میں پوچھا ''یہ کیا کر رہی ہو؟ پاگل تو نہیں ہوئی ہو؟''

اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''ہاں ہو گئی ہوں۔ تم بھی آ جاؤ بہت مزہ آ رہا ہے''۔

میں نے اُسے چپ کروایا کہ باہر بھائی ہے سن لے گا۔ اُس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر کھینچا۔ میں اُسے روک رہا تھا مگر وہ نہیں مان رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے گلے میں ڈالے اور جھولنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نشے میں ہو۔ وہ پوری طرح گیلی ہو چکی تھی، بہک چکی تھی اور مجھے بہکا رہی تھی اور اُس کی جال میں، میں پھنس رہا تھا۔ اُس کی گیلی زلفیں اُس کے چہرے پہ آئی ہوئی تھیں جس میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سا نشا تھا جو مجھے چھڑتا جا رہا تھا۔ ایسی مدہوشی چھانے لگی تھی کہ کچھ سمجھ نہیں

آ رہا تھا، اس لیے تو وہ مجھ سے اپنی نظریں ملا کہ مجھے نشے میں کرنا چاہتی تھی۔ جب اُس کی نظروں نے اپنا کام کر لیا تو اُس کی لبوں کی سُرخی نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اُس میں کشش اتنی زیادہ تھی کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا اور میں اُس کی طرف بڑھتا گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر دی اور ایسا لگا جیسے سحر ٹوٹ گیا۔ مجھے وہی منظر یاد آ گیا جب میں نے ثانیہ کو کس کیا تھا اور جیسے ہی ثانیہ سامنے آئی تو میں پوری طرح ہوش میں آ گیا اور اُس کو پیچھے دھکیل کر باہر نکلا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کچھ ہوا نہیں۔

اُس کو تولیہ دیتے ہوئے کہا ''اپنے آپ کو پونچھ لو۔ میں دیکھتا ہوں اگر بھائی کمرے میں گئے ہوں تو میں تمہیں باہر تک چھوڑ دوں''۔

میں باہر آیا تو بھائی کمرے میں تھے اور دروازہ بند تھا وہ فون پہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ یہی موقع تھا اس لیے میں نے جلدی جا کر اُسے کمرے سے نکالا اور جانے کا کہا۔ وہ خاموش تھی کچھ نہیں کہا اور جاتے ہوئے ایک بار مڑ کر دیکھا پھر آنکھیں نیچے کر کے چلی گئی۔ مجھے اُسے پہلے سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ میں کسی اور سے پیار کرتا ہوں اور میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

کئی ہفتے ہو چکے تھے میں نے ثانیہ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی پریشان ہو رہی تھی کہ آخر کیا ہوا ہے کہ وہ فون نہیں کر رہا اس لیے اُس نے سارہ کو کہہ دیا اور سارہ نے احتشام سے پتہ کرنے کا کہا تو اُس نے مجھے فون ڈے پہ فون کیا۔ میں نے اُسے سارہ واقع بیان کیا۔

احتشام نے کہا ''میں اُسے کہہ دیتا ہوں لیکن فل حال تم موبائل مت لو کیونکہ اس بار بات بگڑ سکتی ہے۔ تھوڑا صبر کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''۔

میں نے جواب دیا ''یہی تو بچا ہے میری زندگی میں، صبر اور انتظار''۔

اُس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ''مایوس نہ ہو دوست۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں''۔

میں نے کہا ''اُسی پہ تو بھروسہ ہے ورنہ کب کا ٹوٹ چُکا ہوتا۔ خیر تم ثانیہ سے کہلوا دو کہ میں بات کرنے کی کوشش کرونگا''۔

میری حالت بگڑنے لگی تھی، ہاسٹل میں ہر وقت اکیلے رہتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ کم وقت گزارتا تھا اور اگر اُن کے ساتھ ہوتا بھی تو بات بہت کم کرتا۔ جلال کی یاد آتی تو نعمان کے پاس چلا جاتا تھا لیکن جب ثانیہ کی یاد آتی تھی تو اُس کا کوئی حل نہیں تھا۔ نہ میں گاؤں جا سکتا تھا نہ میں اُسے فون کر سکتا تھا۔ میں بہت بے بس تھا، ایسی رات نہیں تھی کہ وہ خواب میں نہ آئی ہو مگر میں کرتا بھی تو کیا کرتا۔ نہ کوئی ثانیہ کو میرا ہونے دے رہا تھا نہ اُس کی یادیں مجھے چھوڑ رہی تھی۔ نہ کوئی مجھے اُسے ملنے دے رہا تھا نہ میں اُسے بھولنے والا تھا۔ نہ یہ دنیا ہم کو ایک ہونے دے رہی تھی نہ ہم اس دنیا کی ماننے والے تھے۔

مہینے گزر گئے اور کیسے گزرے یہ صرف ہمیں پتہ تھا۔ دسمبر کے آخر میں ہمیں ایک مہینے کی سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں اور تب مجھے ابو نے گھر بُلا لیا۔ میں چھ مہینے بعد گاؤں جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میں کئی سال بعد جا رہا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کتنا بدل گیا ہوگا، بچے بڑے ہوئے ہونگے، بڑے بوڑھے ہوئے ہونگے، اور پتہ نہیں کیا کیا ہوا ہوگا۔ دیکھنے میں تو چھ مہینے اتنے نہیں لگتے لیکن اگر میری نظر سے دیکھا جائے تو چھ سال سے زیادہ تھے۔ گاؤں میں لوگ بڑی عزت سے مل رہے تھے کیونکہ میں پہلی بار اتنا وقت باہر گزار کر آیا تھا۔ ابھی یہاں پہ سردیوں کی چھٹیاں نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اگلے دن موبائل خرید لیا اور سارہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ثانیہ سے بات ہوئی اور میں نے کہا کہ میں کل ملنے آ رہا ہوں۔

اُس نے منع کیا کہ ''گھر والوں کو پتہ چل جائے گا''۔

میں نے کہا ''مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں ہے مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا کہ میں تم سے اتنے عرصے کے لیے دور رہوں۔ مجھے کل ہی ملنا ہوگا''۔

وہ پوچھنے لگی ''کیسے ملو گے؟ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں اور وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا''۔

میں نے جواب دیا ''تم وہ مجھ پہ چھوڑ دو۔ بس سارہ کے پاس رہنا میں اُسے چھٹی کے دوران کال کرونگا''۔

میں، احتشام اور اُس کا ایک اور دوست چھٹی سے کچھ وقت پہلے ثانیہ کے سکول گئے۔ وہاں ثانیہ کا ڈرائیور اپنی گاڑی کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے احتشام کے دوست سے کہا کہ وہ جا کر اُس کو باتوں میں لگا لے اور گاڑی سے دور لے جائے تب احتشام جا کر اُس کے گاڑی کے ٹائرز سے ہوا نکالے گا۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا، دو ٹائرز سے ہوا نکالی گئی۔ میں دور کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ جب چھٹی ہوئی اور ثانیہ سکول سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی تو تب ڈرائیور کو پتہ چلا کہ اُس کے گاڑی کے ٹائرز میں ہوا نہیں ہیں۔ اُس نے ثانیہ کو واپس سکول جانے کا کہا اور کہا کہ ''میں ہوا بھروا کہ آتا ہوں''۔ اُس نے گاڑی کے ٹائرز کھولے اور اُسے لے کر چلا گیا۔

میں نے احتشام کے دوست کو اُس کے پیچھے بھیجا اور کہا کہ ''جب وہ واپس آنے لگے تو مجھے کال کر لینا''۔

وہ اُس کے پیچھے چلا گیا اور احتشام ادھر اُدھر نظر رکھنے لگا۔ میں نے سارہ کو فون کیا وہ گیٹ تک آئی میں اندر جانے لگا تو گارڈ نے روکھا کہ ''انجان شخص کا اندر جانا منع ہے''۔
تب میں نے اُس کے جیب میں کچھ پیسے ڈالے تو اُس نے جانے دیا۔ سکول تقریباً خالی ہو چُکا تھا۔ سارہ مجھے ایک کلاس روم میں لے گئی جہاں ثانیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوئی اور میں نے اُسے گلے لگا لیا۔ سارہ چلی گئی تو ثانیہ رو پڑی میں نے اُسے چپ کرایا اور اُس کے آنسو پونچھ دیئے۔
کہنے لگی ''کتنی بے درد ہے یہ محبت نہ چین سے جینے دیتی ہے نہ مرنے کی اجازت''۔
میں نے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''ہر رات کے بعد سویرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری اس دوری کے بعد ملن ضرور ہوگا اور ہمارے اس درد کے بدلے خوشی ضرور ملے گی''۔
میں بیٹھا اور اُسے اپنے پاس بیٹھا دیا۔ وہ میرے گود میں لیٹ گئی اور مجھے دیکھ رہی تھی۔
میں نے اُس کا ماتھا چوما اور کہا ''جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی ہو۔ یہ کونسا منتر ہے کہ دن بہ دن خوبصورت ہوتی جا رہی ہو''۔
وہ مسکرا کر کہنے لگی ''یہ جادو تمہارے نظروں میں ہے جو دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے اس لیے میں خوبصورت نظر آ رہی ہوں''۔
میں نے کہا ''اُمید کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی بڑھتا رہے تا کہ میں زندگی بھر تمہارا دیوانہ بن کر رہوں''۔
کہنے لگی ''زیادہ دیوانگی دکھاؤ گے تو لوگ پاگل کہیں گے اور طعنے دیں گے''۔
میں نے جواب دیا ''پاگل تو اب بھی کہتے ہیں تو کیا یہ دیوانگی چھوڑ دوں گا؟ نہیں!۔ طعنے تو اب بھی ملتے ہیں تو کیا تمہیں چھوڑ دوں؟ نہیں!''۔
میں کچھ دیر چپ رہا پھر میں نے اُس سے کہا ''میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اُمید ہے تم بُرا نہیں مانو گی''۔
وہ متوجہ ہوئی اور پوچھا ''کیا بات ہے بولو؟ میں بُرا نہیں مانوں گی''۔
میں نے کرن کے بارے میں کہا وہ سب کچھ جو ہوا تھا۔ پہلے ثانیہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر کہا ''مجھے تم پہ بھروسہ ہے۔ میں نے تمہارا بھروسہ کبھی نہیں توڑا اور مجھے پتہ ہے تم بھی ایسا نہیں کرو گے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے یہ بات کہی۔ مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو''۔
میں نے کہا ''مجھے اُمید تھی کہ تم بُرا نہیں مانو گی''۔ پھر میں نے پوچھا کہ ''گھر کا کیا حال ہے کوئی اب شک کرتا ہے یا نہیں؟''
کہنے لگی ''کچھ مہینوں سے معاملہ ٹھنڈا ہوا ہے۔ کوئی اتنا پرواہ نہیں کر رہا اور جو زیادہ شک کرتے تھے یعنی تایا اُنہیں پاگل پن کے دورے آنے لگے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اُن کو جلال کی بد دعا لگی ہے۔ رہی بات دوسرے چچا کی تو اُن پہ قتل کا الزام ہے اور وہ مفرور ہیں۔ ابو ہیں وہ اتنی پرواہ نہیں کرتے''۔
میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارا راستہ صاف ہو رہا ہے۔ اگر تایا اور پاگل ہمارے رستے سے ہٹ گئے تو ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کاش جلال اِس وقت ہوتا تو کتنا خوش ہوتا''۔
اُس کے آنکھیں پھر بھر آئی اور کہا ''اُس نے ہمارے لیے قربانی دی تھی اور لگتا ہے کہ اُس کی قربانی رنگ لا رہی ہے''۔
میں نے پوچھا کہ ''تمہارا منگیتر، کیا وہ شک کرتا ہے؟ کیا وہ تمہیں لینے کبھی سکول آیا ہے؟''
اُس نے جواب دیا ''نہیں وہ ایسا نہیں ہے، وہ بہت اچھا ہے۔ وہ اتنا تنگ خیال نہیں ہے۔ (مسکراتے ہوئے کہا) تمہاری طرح تو بلکل نہیں''۔
میں نے کہا ''اچھا! تو وہ اچھا ہے؟ اور میں بُرا ہوں؟ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا''۔
میں نے منہ دوسرے طرف کیا تو بڑے پیار سے میرا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا ''ہاں تم بہت بُرے ہو مگر میرے لیے زندگی اور ہر سانس سے زیادہ قیمتی ہو۔ تم اگر روٹھ جاو گے تو میں مر جاؤنگی۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں؟''
میں نے اُس کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''میری آنکھوں میں دیکھو تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟''
وہ غور سے دیکھنے لگی اور کہا ''میرا عکس اور اُس کے سامنے تم گھٹنے ٹھیکے ہوئے پیار کا اظہار کر رہے ہو، میرے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو۔ کیا تم اتنا پیار کرتے ہو؟''
میں نے کہا ''ہاں! کیا کم ہے؟''
وہ کہنے لگی ''نہیں! بہت ہے۔ اب تم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ ان میں کیا ہے؟''

میں نے دیکھا کہ ''ہم صحرا میں ہیں اور میں پیاس سے بے حال ہوں دور دور تک پانی کا نام ونشان نہیں اور تم نے اپنا ہاتھ چھری سے کاٹ کاٹ کر اپنا خون مجھے پلا رہی ہو''۔

مجھے واقعی کچھ ایسا لگ رہا تھا۔ میں یہ بول کر چپ ہو گیا اور مجھے احساس ہوا کہ ثانیہ کا پیار مجھ سے کئی گنا زیادہ ہے۔

وہ مسکرا کر بولی ''یہ تو کچھ بھی نہیں اس سے اور کئی زیادہ پیار کرتی ہوں میں تم سے''۔

میں نے کہا ''میں بہت خوش قسمت ہوں کہ تم جیسی پیاری اور پیار کرنے والی میری گود میں سر رکھے ہوئی ہے اور مجھ پہ مرمٹنے کی باتیں کر رہی ہے''۔

ہم باتوں میں لگے ہوئے تھے کہ فون آیا کہ ڈرائیور پہنچنے والا ہے۔ ثانیہ اُٹھ کر جانے لگی تھی کہ میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور گلے سے لگا لیا۔

وہ کہنے لگی ''اتنی بار گلے سے لگاؤ گے تو میرا جانا مشکل ہو جائے گا''۔

میں نے کہا ''کیا کروں چھوڑنے کا بھی دل نہیں کر رہا''۔

میں نے اُسے ہونٹوں پہ کِس کرتے ہوئے کہا ''اُمید ہے کہ پھر جلدی ملیں گے؟''

وہ مجھ سے جُدا ہوئی اور باہر چلی گئی۔ ڈرائیور نے ٹائرز گاڑی میں لگائے اور ثانیہ کو بُلا کے چلا گیا۔ مجھے احتشام نے فون کیا کہ وہ لوگ چلے گئے تب میں بھی باہر آیا۔

ثانیہ کے گھر دیر سے جانے پہ ڈرائیور سے پوچھ گچھ ہوئی تو اُس نے بتایا کہ ''کسی نے ٹائرز کی ہوا نکالی تھی اس لیے مجھے اُسے بازار بھروانے کے لیے لے جانا پڑا۔ اس لیے آنے میں دیر ہو گئی''۔

اُنہیں شک ہوا کہ یہ میں ہی کر سکتا ہوں اس لیے میرا پتا کیا کہ میں آیا ہوں کہ نہیں اور جب پتہ چلا کہ میں آیا ہوں تو شک یقین میں بدل گیا۔ بات پاگل تک پہنچ گئی اور وہ مجھے مارنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس لیے اُس نے چھٹی کے بعد سکول اور ثانیہ پہ نظر رکھنا شروع کر دی۔ ثانیہ نے یہ باتیں امی ابو کو کرتے ہوئے سن لی تھی۔ اس لیے اُس نے سارہ سے فون لے کر مجھے کال کی پوری بات بتائی کہ کیسے اُن کو پتہ چلا اور پھر کہا کہ ''سکول آنے کی کوشش مت کرو چچا مجھ پہ نظر رکھے ہوئے ہیں اور وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچائے''۔

میں نے ویسا ہی کیا جیسا ثانیہ نے کہا تھا۔ میں جب تک یہاں تھا وہ ثانیہ پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان وہ پھر سے ہڈی بن رہے تھے اور ہمیں ملنے سے روک کے رکھا ہوا تھا۔ وہ لوگ ایسا کوئی موقع دیکھ رہے تھے کہ میں اکیلا ہوں اور وہ لوگ مجھے پالے۔ مگر یہ گاؤں میں بہت مشکل تھا۔ اس بار میں شہزاد کو بھی بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ روزانہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا اور مجھ سے باتیں کرتا رہتا تھا مگر نہ اُس نے یہ عنوان چھیڑا نہ میں نے اُسے اس بارے میں کچھ بتایا۔ گھر والوں کو یہ لگ رہا تھا کہ میں اُسے بھول گیا ہوں اس لیے اُنہوں نے میری زیادہ پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی۔ میری چھٹیاں ختم ہوئی اور میں ہاسٹل چلا گیا۔ میرا دل کہی نہیں لگ رہا تھا۔ دوستوں کے پاس بیٹھا ہوتا سوچ کہیں اور ہوتی، بات اُن سے کر رہا ہوتا تھا عنوان کوئی اور ہوتا، اُن کے سامنے مسکراتا تھا اور دل ہی دل میں روتا۔

کرن اُس واقع کے بعد گھر نہیں آئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے کئے پہ پچھتا رہی تھی۔ غلطی میری تھی مجھے اُسے پہلے سے بتا دینا چاہئے تھا۔ دو ہفتے بعد جب میں گھر گیا۔ تو اس مرتبہ وہ آ گئی اور اُس نے جو کیا تھا اُس کی معافی مانگ لی۔

میں خفہ بیٹھا ہوا تھا وہ میرا پریشان چہرہ دیکھ کر بولی ''لگتا ہے کسی کی یاد میں کھوئے ہوئے ہو؟ اس لیے تو اتنے اُداس لگ رہے ہو''۔

میں نے پوچھا کہ ''تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟''

اُس نے جواب میں کہا ''کیونکہ میں بھی کسی سے پیار کرتی ہوں اور یہ کئی مہینے اُس سے دور رہی تھی تو میں بھی ایسی تھی۔ ہر وقت سوچوں میں گم ہوتی تھی اور ہر وقت اُداس ہوتی تھی''۔

میں نے پوچھا کہ ''تم کس سے پیار کرتی ہو؟''

تو اُس نے کہا ''تم سے۔ کیا تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ تھا؟''

میں نے مسکرا کر کہا ''میں کسی اور سے پیار کرتا ہوں اور اتنا کرتا ہوں کہ کسی اور کے لیے تھوڑا بھی پیار نہیں بچا۔ مجھ سے پیار کر کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا''۔

وہ بولی ''مجھے اُس دن پتہ چل گیا تھا۔ اس لیے تو میں نہیں آ رہی تھی اور تمہیں بھولنے کا سوچ رہی تھی مگر نہ کر سکی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت روکھا کہ نہ آؤ لیکن اس بار روک نہیں پائی اس دل کو۔ یہ تو صاف ہے کہ تم کسی اور سے پیار نہیں کر سکتے لیکن ہم اچھے دوست تو بن سکتے ہیں؟''

اُس دن میں نے پہلی بار اُس سے ایسی بات کی، ہم بہت دیر تک گپ لگاتے رہے پھر وہ اپنے گھر چلی گئی اور میں باہر نکل آیا۔ میں کافی دیر گھوم رہا تھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے راستے بدلے مگر وہ سچ میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں واپس گھر جانے لگا اور جب میں اپنے گھر کے گلی تک پہنچا تو وہ اور آگے نہیں آیا مجھے شک ہوا کہ یہ پاگل نے میرے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ اگلے دن بھی کچھ یوں ہوا کہ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پتہ کرنا چاہیے کہ اس کو کس نے بھیجا ہے۔ میں پلٹا اور اُس کو پکڑنے کے لیے دوڑا وہ مجھے دیکھ کر بھاگنے لگا کچھ دیر بھاگتا رہا پھر میرے ہاتھ آ گیا۔ میں اُس کو مارنے لگا اور پوچھ رہا تھا کہ ''کس نے بھیجا ہے تمہیں میرے پیچھے؟''

میں نے اُسے بہت مارا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ لوگ آئے اور اُسے مجھ سے چھڑا لیا تو وہ بھاگ گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ پاگل کا کام ہے۔ میں نے تب بھی بھائی سے کچھ نہیں کہا پھر وہ پریشان ہو جاتے اور مجھے تب ہاسٹل سے گھر بھی نہ آنے دیتے۔

میں ہاسٹل گیا۔ جب نعمان سے بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ ''ہم ایبٹ آباد میں گھر کرائے پہ لے رہے ہیں اور میں ہاسٹل سے جا رہا ہوں''۔

میں بہت پریشان ہوا اور کہا ''تو تم بھی ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

وہ بولا ''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے''۔

میں نے جواب دیا ''سب ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور اپنی یادوں سے تڑپاتے رہتے ہیں۔ ہم اچھے دوست تو رہیں گے لیکن ایک دوسرے سے دور تو ہونگے نہ۔ اور اس بات کا تو ہمیشہ دکھ ہوگا''۔

وہ مسکرا کر کہنے لگا ''تم جب بھی یاد کرو گے میں آجایا کرونگا۔ اور جتنا یاد کرو گے اُتنی بار آونگا''۔

میں مسکرایا اور اُسے گلے لگا لیا۔ دو ہفتے بعد میں گھر نہیں گیا کیونکہ ہاسٹل والے لڑکے نتھیا گلی ٹرپ پہ جا رہے تھے۔ میں بھی اُسی کے لیے رک گیا۔ ہفتہ کو احتشام کا فون آیا اور کہا کہ ''سارہ کہہ رہی تھی کہ ثانیہ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ کیا تم اُس کا انتظام کر سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''سارہ کو کہنا کہ ثانیہ کو بتا دے کہ میں کوشش کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے؟''

اتوار کو ٹرپ پہ جانا تھا میں پریشان تھا کہ ثانیہ کو کیسے کال کروں۔ اس پریشانی کی وجہ سے میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن شیخ اور شکیل نے زبردستی روانہ کیا۔ ہم بس میں بیٹھے اور نتیا گلی روانہ ہوگئے۔ سارے دوست تھے، سارے خوب مستی کر رہے تھے بس ایک میں تھا اُداس۔ میں نتیا گلی پہلی بار جا رہا تھا۔ بس میں کھڑکی کی طرف بیٹھ کر باہر دیکھ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بس میں ٹیپ لگا ہوا تھا اور لڑکے ناچ رہے تھے۔

نعمان میرے پاس آیا کہا ''کل رات سے پریشان ہو کیا ہوا ہے؟''

میں نے کہا ''زندگی نے اتنے دکھ دیئے ہیں کہ اب پریشان ہونے میں مزہ آتا ہے''۔

اُس نے پھر پوچھا ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

میں نے جواب دیا ''تم نے سوال ہی ایسا پوچھ لیا کہ جس کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے''۔

وہ کہنے لگا ''اس دل میں اگر ساری باتیں قید کر کے رکھو گے تو یہ پھٹ جائے گا اور اگر کسی کو اپنے دل کا حال بیان کرو گے تو اُس سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے''۔

میں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''اس بوجھ کو اُٹھانے کا عادی ہو گیا ہوں۔ یہ کئی سالوں سے میرے دل میں ہے''۔

اُس نے کہا ''شاید تم کسی پہ بروسا نہیں کر سکتے؟''

میں نے کہا ''نہیں! یہ بروسے کی بات نہیں ہے۔ ساری زندگی اکیلے گزاری ہے بس کسی سے اپنے دل کی بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہے''۔

وہ بولا ''جو بھی ہوا گر تمہیں لگے کہ میں اس قابل ہوں کہ تمہارے غم میں شریک ہو سکتا ہوں یا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے ضرور یاد کرنا''۔

میں نے کہا ''تم میرے لیے پریشان مت ہو۔ میں اپنے آپ کو سنبال لونگا''۔

ہم نتھیا گلی پہنچنے والے تھے کہ شیخ نے میرے ساتھ مستی کرنی شروع کر دی۔ میں نے بہت منع کیا مگر وہ نہیں مانا اور اُس مستی میں میری عینک ٹوٹ گئی۔ تب وہ آرام سے بیٹھ گیا۔

مجھے بہت غصہ آیا ہوا تھا اور عینک ٹوٹنے کی وجہ سے میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ جب ہم پہنچے تو لڑکے اُتر کر پورے بازار میں پھیل گئے میں غصہ اور سر کے درد کی وجہ سے بس میں رہا۔ نعمان اور شکیل نے بہت کہا کہ چلو گھومنے چلتے ہیں مگر میں نے انکار کیا۔ وہ چلے گئے اور میں بس میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر بس سے اُتر کر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا جہاں دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا اور یہ سوچ رہا تھا کہ ثانیہ کو ایسی کیا ضروری بات کرنی ہے آخر کیا ہوا ہے اور اُس سے بات کیسے ہوگی کہ اچانک پیچھے سے کسی نے میرے گلے میں رسی ڈالی اور رسی زور سے کھینچی۔ میں نے رسی کو گلے سے ہٹانے کی کوشش کی مگر اُس نے بہت زور سے کھینچی ہوئی تھی۔ میں پاؤں مارنے لگا کیوں کہ مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی، میری آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اُس نے مجھے کھڑا کیا، مجھے وہ دیکھائی نہیں دے رہا تھا میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ میرے سامنے پاگل آیا اور میری آنکھیں حیرت سے اور بھی نکل آئیں۔

وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا ''تمہیں کیا لگتا ہے جو تم کرتے ہو اور جہاں تم جاتے ہو مجھے پتہ نہیں چلتا۔ میں نے تمہارے ہر قدم پہ نظر رکھی ہے اور آج مجھے موقع ملا ہے کہ تم سے نپٹوں''۔

میرے دائیں طرف ایک اور شخص بھی کھڑا تھا میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا۔

پاگل نے خنجر نکالا اور اُسے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''اُس رات کی کسر آج پوری کرونگا۔ میں تمہارے جسم کا ہر حصہ الگ کر دونگا۔ پھر اُس کو اور بھی چھوٹے چھوٹے کر کے بوری میں ڈال کر لے جاؤنگا اور پہلے ثانیہ کو دیکھاؤنگا کہ میں نے تمہارہ کیا حل کیا ہے اور پھر اپنے گلی کے کُتو کو کھلاونگا۔ تاکہ تمہارے خاندان والے تمہاری لاش کے لیے بھی ترس جائیں''۔

وہ میرے قریب آرہا تھا میں نے اُس کے ٹانگوں کے بیچ لات ماردی، وہ درد سے سکھڑ گیا تو میں نے اُس کے سینے پہ ایک اور لات ماری اور وہ زمین پہ گرا، خنجر اُس سے دور گر گیا اور پہاڑ سے لڑکنے لگا۔ دوسرے شخص نے میرے پیٹ میں مکے مارنا شروع کر دیے۔ میں نے اُس کی ناک پہ سر سے وار کیا، اُس کی ناک کی ہڈی ٹوٹی اور خون بہنا شروع ہو گیا پھر میں نے اپنے آپ کو پیچھے دھکیلا اور پچھلے شخص کو گرالیا۔ رسی اُس نے اور زور سے کھینچی لی تھی اور میری سانس بلکل بند ہو گئی تھی اُوپر سے وہ دوسرا اور غصہ ہو کر مجھے مسلسل مکے مار رہا تھا۔

میں نے اُسے بھی لات ماری، اپنی پوری طاقت لگائی اور اپنے آپ کو چھڑالیا۔ میری سانس خراب ہو گئی تھی ٹھیک طرح سانس نہیں لے پا رہا تھا جس کی وجہ سے میں کھانسنے لگا۔ رسی والے شخص نے مجھے پھر پکڑنے کی کوشش کی میں نے اُس کی آنکھوں میں دھول ڈال دی۔ پاگل چھری اُٹھانے کے لیے دوڑا اور دوسرے شخص نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ میرے ہاتھ رسی آئی، ہم لڑنے لگے تو میں نے رسی اُس کے گلے میں ڈال دی اور اُس کے منہ پہ مکے مارنے لگا۔ وہ بلکل بے دم ہو گیا تو میں نے پچھلے شخص کو جو کہ اپنی آنکھیں مل رہا تھا منہ پہ لات مار کر ڈھیر کر دیا۔ اتنے وقت میں پاگل چھری لے کر آ گیا میں نے دوڑ کر اپنے سر کو اُس کے پیٹ میں دے مارہ اور ہم نیچے لڑکنے لگے اور ایک دوسرے کو مارتے رہے۔

جب ہم رک گئے تب میرے ہاتھ ایک پتھر آیا جو کہ فوراً میں نے پاگل کے سر میں دے مارا اور اُس سے خنجر چھین لیا۔ میرا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا تھا اور چہرہ بھی کئی جگہ زخمی ہوا تھا۔ پاگل بھی کافی زخمی ہوا تھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔

میں نے خنجر اُس کی طرف پکڑتے ہوئے کہا ''اب بولو کہ میں تیرے ساتھ کیا کروں، کیا ویسا کروں جیسا تم نے کہا تھا کہ ٹکڑے کر کے کُتوں کو کھلا دوں؟''

وہ سر پہ لگی چوٹ کے درد سے کراہ رہا تھا۔ میں بولا ''مگر میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں یعنی اس بار تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر پھر ایسی حرکت کی یا میرے اور ثانیہ کے بیچ آنے کی کوشش کی تو تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے ساتھ کیا کرونگا۔ اور پتہ نہیں اس کے بارے میں میرے خاندان والوں کو پتہ چل گیا تو اس بار وہ تم لوگوں کے ساتھ کیا کریں گے''۔

وہ کچھ نہ کہ پایا اور کھڑا ہونے لگا تھا کہ میں نے ایک زور کی لات مارتے ہوئے دوبارہ اُسے زمین پہ بچا دیا اور کہا ''اور ہاں میرا پیچھا کرنے کی غلطی بھی مت کرنا بہت مہنگا پڑے گا تمہیں۔ اس پہاڑ سے اُترتے ہی میں اکیلا نہیں رہونگا۔ دوستوں کی فوج ہے میرے ساتھ تب تم نہیں تمہاری لاش جائی گی''۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا۔

نیچے آیا تو سارے دوست گرد جمع ہوئے اور میرے چہرے پہ چوٹ کے نشانات اور رسی سے گلے پہ لگے ہوئے نشان دیکھے تو سوال پوچھنے شروع کر دئے۔ میں نے خنجر آستین میں چُھپا لیا تھا اگر کوئی اُسے دیکھ لیتا تو بات بگڑ سکتی تھی۔

شیخ غصہ میں کہنے لگا ''کس کے ساتھ لڑائی کی ہے صرف نام بتاؤ ابھی اُسے سبق سکھا کر آتا ہوں''۔

میں نے کہا ''کوئی لڑائی نہیں کی ہے بس پہاڑ پہ چڑھ رہا تھا سر میں درد تھا اور عینک بھی نہیں تھی تو پاؤں پھسلا اور گر گیا''۔

شکیل نے کہا ''چلو مان لیتے ہیں کہ تم پہاڑ سے گرے ہو لیکن تمہارے گلے پہ جو نشان ہے وہ کیسے لگا ہے وہ تو گرنے سے نہیں لگ سکتے''۔

حسن بولا ''یہ تو ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی نے تمہارے گلے میں کچھ ڈال کر کھینچا ہو۔ یہ گرنے سے نہیں لگے ہیں''۔

نعمان نے کہا ''تم نے تو کہا تھا کہ میں بس میں ہی رہنا چاہتا ہوں تمہارے سر میں درد ہے پھر پہاڑ پہ کیا کرنے گئے تھے؟''

شیخ نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''بول کہ کس کے ساتھ لڑائی کی ہے۔ کیا تم ہمیں دوست نہیں سمجھتے کہ ہم سے بات چُھپا رہے ہو؟''

میں بے بس تھا کیونکہ سچائی میں اُن سے کہہ نہیں سکتا تھا اور اُن کا بھروسہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے جواب دیا ''میں سچ کہہ رہا ہوں میں گر گیا تھا اور میری ٹائی اٹک گئی تھی جس کی وجہ سے میرے گلے پہ نشان پڑ گیا۔ میں تم لوگوں سے جھوٹ کیوں بولوں گا اگر کسی سے لڑائی کی ہوتی تو تم لوگوں کو سب سے پہلے بتا تا اس میں چُھپانے والی کونسی بات ہے''۔

شیخ میرا جواب سن کر ٹھنڈا ہوا اور کہا ''یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ تم نے کبھی لڑائی نہیں کی اور نہ لڑائی جھگڑوں والے بندے ہو پھر تم کیسے لڑائی کر سکتے ہو اور عینک ٹوٹنے کے لیے میں معافی مانگتا ہوں یار''۔

میں بولا ''نہیں یار بس یہ قسمت میں تھا''۔

شکیل نے کہا '' اگر تم ہماری بات مانتے اور ہمارے ساتھ چلتے تو ایسا کچھ نہیں ہوا ہوتا۔ آئندہ محتاط رہنا ایسی غلطی مت کرنا''۔

حسن نے کہا ''یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ زیادہ زخمی ہوتے اور چلنے کے قابل نہیں ہوتے تو ہمیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہو تم''۔

شکیل اور نعمان کو میری بات کا یقین نہیں تھا اس وقت کچھ نہیں کہا لیکن اُن کی آنکھیں سوال پوچھ رہی تھیں۔ مجھے بس لے جایا گیا۔ نعمان اور شکیل میرے لیے جوس لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ نعمان میرے پاس بیٹھا تو اُس کا ہاتھ خنجر کے ساتھ لگا اور اُسے پتہ چل گیا کہ میرے پاس خنجر ہے۔

وہ اُٹھا اور شکیل کے کان میں کہہ دیا کہ ''اُس کے پاس چھری ہے''۔

شکیل نے مجھ سے وہ خنجر لینا چاہا لیکن دوسرے لڑکے بس میں آ گئے تو اُس نے اُس وقت کچھ نہیں کہا۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا کہ یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ نعمان تب بھی ڈر رہا تھا کہ یہ پھر نہ کچھ کر لے۔ کچھ دیر میں بس لڑکوں سے بھر گئی اور ہم واپس ہاسٹل لوٹنے لگے۔ میں نے پریشانی ظاہر نہیں کی اور ایسا پیش آنے لگا کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی شکیل اور نعمان کو شک تھا کہ کچھ تو ہوا ہے جو یہ ہمیں نہیں بتانا چاہتا۔ اس بات پہ شکیل اور نعمان مجھ سے خفہ ہوئے تھے اور نعمان نے تو کئی دن مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔ بڑی مشکل سے دونوں کو منایا لیکن یہ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک دو ہفتے بعد ہمیں کچھ دن کے لیے چھٹیاں ہونی تھیں۔ اُن دو ہفتوں میں، میں نے ایسا ظاہر کیا کہ میں خوش ہوں کیونکہ جن لوگوں کو مجھ پہ شک تھا وہ شک دور کرنا تھا۔ نعمان کو اِن چھٹیوں کے بعد ہاسٹل چھوڑنا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے خفہ ہو کر جائے۔ چھٹیوں سے پہلے بھائی ملنے کے لیے آئے تھے تب میرے چہرے سے نشانات تقریباً ختم ہو چکے تھے اس لیے اُنہیں اُس کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے اُن سے گاؤں جانے کا کہا بھائی کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اُن کے ذہن میں تھا کہ معاملہ سُدھر اہوا ہے۔ مجھے اجازت ملی اور میں چھٹیاں ہوتے ہی گاؤں پہنچ گیا۔

اگلے دن ثانیہ سے بات ہوئی کہ میں ملنے آ رہا ہوں اور دوسرے دن ہمیں ملنا تھا۔ اس بار میں نے کچھ اور سوچا ہوا تھا۔ رات کو ڈرائیور کو کھانا دیتے ہوئے میرے کہنے کے مطابق ثانیہ نے پیٹ خراب ہونے کی دوائی اُس میں ڈال دی اور اس ڈر سے کہ کام نہیں کرے گی اس لیے اُس نے زیادہ ڈال دی۔ صبح پتہ چلا کہ اُس نے بہت زیادہ ڈالی ہوئی تھی اور ڈرائیور بیچارہ بستر سے اُٹھنے کے لائق بھی نہیں تھا اُسے ڈریپ لگائے گئے۔ اُس کی حالت بہت خراب تھی۔ ثانیہ کے ایک کزن نے ثانیہ کو سکول چھوڑا اور کہا کہ میں چھٹی کے وقت لینے آؤنگا۔ چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے میں اپنی گاڑی لے کر سکول گیا اور چوکیدار سے بات کی، کچھ پیسے دیئے اور اندر جانے کی اجازت ملی۔ چوکیدار کو ایک چھوٹا سا کمرہ سکول کی طرف سے ملا تھا میں وہاں گیا اور ثانیہ کو بھی وہاں بُلا لیا۔

وہ مجھ سے ملتے ہی پوچھنے لگی کہ ''میں نے سُنا تھا کہ ہمارے خاندان والے تم پہ ایبٹ آباد میں نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں فون کرنے کا کہا تھا کہ تمہیں یہ بات بتا دوں۔ کیا اُنہوں نے تمہارے ساتھ تو کچھ کیا نہیں؟''

میں نے کہا ''ہاں مجھے پتہ ہے''۔ اور پھر میں نے اُسے پورا قصہ سُنا دیا۔

وہ ہنسنے لگی اور کہا ''شکر ہے تمہیں کچھ ہوا نہیں۔ تب ہی میں سوچوں کہ چچا گھر کیوں نہیں آتے ہیں لگتا ہے شرم کی وجہ سے منہ نہیں دکھانا چاہتے۔ اور ایسا لگ رہا ہے کہ بڑے بہادر ہو

گئے ہو؟ تین تگڑے بندوں کو ڈھیر کر دیا''۔

میں نے مسکرا کر بولا ''ہاں وہ کہتے ہیں نہ کہ پیار میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور شاید تمہارے چچا میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والے اس لیے اُن کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ اُنہیں سمجھا دو مر جائے گا میرے ہاتھ سے''۔

یہ کہ کر میں ہنسا اور وہ بھی ہنس پڑی۔ کہنے لگی ''ہاں ہاں میں سمجھا دونگی کہ میرے شیر سے دور رہو ورنہ کھا جائے گا تمہیں۔ ویسے کونسے شیر ہو جنگل والے یا سرکس والے''۔

میں مسکرایا اور کہا ''شیر شیر ہوتا ہے چاہے جنگل کا ہو یا سرکس کا بس فرق اتنا ہوتا ہے کہ سرکس والا شیر حالات کے مطابق جینا سیکھ لیتا ہے''۔ پھر میں نے اُسے اپنے دل کے قریب کیا اور کہا ''اب تم ہی بتاؤ کہ یہ جنگل کے شیر کی دھڑکن ہے یا سرکس والے شیر کی؟''

اُس نے میرے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''وہی جو میرا دل لے گیا ہے، کیا فرق پڑتا ہے وہ کہاں رہتا ہے''۔

میں نے اُس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پہ رکھا اور ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور میرا دوسرا ہاتھ میں نے اُس کے کمر پر رکھا۔ اُس نے پوچھا ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

میں نے جواب دیا ''ڈانس''۔

یہ ڈانس نہ مجھے ٹھیک طریقے سے آتا تھا نہ اُسے۔ بس ہم گھومتے رہے اور ہنستے رہے۔ اُسی کی ہنسی سے پھول چھڑک رہے تھے، اُس کے چہرے سے نور نکل رہا تھا، اُس کے جسم سے عجیب مہک آ رہی تھی۔ وہ تھک گئی تو مجھ سے لپٹ گئی اور کہا ''بس جی اور ناچنا نہیں ہوتا''۔

ہماری اس ملاقات کے دوران پاگل کو پتہ چل گیا تھا کہ میں آیا ہوا ہوں۔ اُسے ڈرائیور کا بیمار ہونا اتفاق نہیں میرا پلین لگا۔ وہ کچھ لوگوں کو لے کر آیا اور سکول کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ سکول کے گارڈز کی وجہ سے زیادہ قریب نہیں آ سکتا تھا۔ وہ میرے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ثانیہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی میں نے اُس کے بال سنوارتے ہوئے کہا ''کیا کبھی ہم ایک ہو پائیں گے؟ کیا یہ دوریاں ختم ہو پائیں گی؟ کیا یہ درد کم ہو پائیں گا؟''

اُس نے جواب میں کہا ''خدا پہ بروسہ ہے کہ ہم ایک ہونگے، پاس ہونگے اور سکون میں ہونگے اگر یہاں نہیں تو اُس جہاں میں''۔

میں نے کہا ''خدا پہ تو بروسہ ہے ورنہ کب کا ٹوٹ چُکا ہوتا''۔

اُس نے کہا ''پھر کب ملنے آؤ گے؟ اور تم کہتے ہو کہ ایبٹ آباد بہت خوبصورت جگہ ہے وہاں کب لے کر جاؤ گے؟''

میں نے جواب دیا ''میرا بس چلے تو کبھی چھوڑ کے نہ جاوں تمہیں لیکن ایسا ہے نہیں۔ اور تمہیں تو پتہ ہے ہم ادھا گھنٹہ مل نہیں سکتے تو ایبٹ آباد کیسے جائیں گے۔ میں کوشش کرونگا کہ جلد از جلد ملیں اور فون پہ بات بھی ہوتی رہے گی''۔

اُس نے مسکرا کر کہا ''تم جو بھی کہو لیکن ایک بار تو مجھے ایبٹ آباد لے جانا ہوگا''۔

میں نے کہا ''ہاں حضور کیوں نہ آج ہی چلیں''۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑی۔

چھٹی ہونے والی تھی میں نے اُس سے رخصتی لی۔ میرے باہر آتے ہی پاگل نے مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھ پہ فائرنگ شروع کر دی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے نیچے زمین پہ بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے چلتے ہوئے گاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ سکول کے گارڈز نے جوابی فائرنگ کی تو معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا اور مسلسل فائرنگ ہوتی رہی۔ سکول میں سارے لوگ سہم گئے تھے اور ڈر کے مارے چیخ رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر ثانیہ جلدی سے میرے پاس آنے کے لیے دوڑی۔ ابھی میں نے ثانیہ کو نہیں دیکھا تھا کہ فائرنگ رک گئی۔ جیسے ہی میں نے پیچھے دیکھا تو ثانیہ مجھے بُلانے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ منہ سے بولنا چاہتی تھی مگر منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کیونکہ اُس کے گلے پہ گولی لگی تھی۔ جب پاگل نے یہ دیکھا کہ ثانیہ کو گولی لگی ہے تو وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ ثانیہ کی یہ حالت دیکھ کر میرے جسم سے جیسے روح نکل گئی تھی۔ میں اپنی جگہ پہ منہ کھولا ہوا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میری آنکھیں نکل آئی تھیں۔ ثانیہ گر پڑی، مجھ میں اتنی سانس نہیں تھی کہ میں چل کر اُس کے پاس جاتا۔ اس لیے رینگتے ہوئے میں اُس کے پاس پہنچا اور اُس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اُس کے گلے سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ میں رونے لگا، گولی اُس کو لگی تھی جان میری جا رہی تھی، خون اُس کا بہہ رہا تھا سانس میری بند ہو رہی تھی، زخم اُس کو لگے تھے درد مجھے ہو رہا تھا۔ میرے آنسو اُس کے چہرے پہ گرے، اُس کے چہرے پہ اطمنان تھا ایسا ظاہر ہی نہیں کر رہی تھی کہ اُس کو گولی لگی ہے۔ اُس کے چہرے پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اپنے ہاتھ سے میرے آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے مدد کے لیے پکارا تو گارڈز دوڑ کر آئے ایک گیا اور گاڑی لے آیا۔

ہم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور میں نے روتے ہوئے کہا ''میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دونگا۔اس کے بعد میں تمہاری ہر بات مانوں گا تمہیں بھگا کر بھی لے جاؤنگا۔تم جو کہو گی میں مانوں گا جہاں چاہو گی لے جاؤنگا بس تم سانس لیتی رہنا''۔

یہ کہ کر میں بے اختیار رو پڑا۔اُس نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی ''رو نہیں، روتے ہوئے بلکل اچھے نہیں لگتے ہو۔یاد رکھنا کبھی نہیں رونا میرے لیے بھی نہیں''۔

کیسے نہیں روتا، وہ میری گود میں تھی، مرنے کی حالت میں تھی اور یہ سب میری وجہ سے تھا۔اُس کو دکھانے کے لیے میں نے اپنے آنسو روک لئے۔اُس کے چہرے پہ اطمنان تھا جیسے جلال کے چہرے پہ تھا۔سانس لینے میں اُسے اور بھی دشواری آئی اور پھر اُس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا جیسے جلال کے منہ سے جھاگ آئی تھی۔میں اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ اپنے دامن سے میں نے اُس کے منہ سے خون صاف کیا۔

ہسپتال پہنچا تو میں نے کہا ''ہم پہنچ گئے ہے بس اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''۔

اُس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ سانس دے دی۔اُس کے جسم سے روح نکال لی گئی۔اُسے اُتارہ گیا اور سڑیچر پہ ڈالا گیا اور اندر لے جایا گیا مگر بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ ڈاکٹر اب کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔اُس نے میری گود میں سانس دے دی تھی، اُس کی لاش کو لے جاتے ہوئے دیکھ کر میں وہاں پہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

دو دن میں، میں کئی بار ہوش میں آیا لیکن زیادہ وقت ہوش میں نہیں رہ پاتا تھا کیونکہ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔کئی دن بعد غم میں ڈوبا، درد سے چُور اپنے ہجرے کے آنگن میں بیٹھا تھا۔آنکھوں میں آنسو لئے منہ آسمان کی طرف کیا ہوا تھا۔اتنا بے حس تھا کہ اگر کوئی آ کر وار بھی کرتا تو مجھے پتہ نہ لگتا۔دل کا درد اتنا تھا کہ آنکھیں کُھلی ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، کان ہونے کے باوجود کچھ سُنائی نہیں دے رہا تھا۔میرا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا، سانس لینا مشکل تھا، دل کی دھڑکن نہ ہونے کے برابر تھی۔کہتے ہیں کہ اُن دنوں موسم بڑے مزے کا تھا، لیکن وہ تو جینے والوں کے لیے تھا، جی کے مرنے والوں کے لیے نہیں۔میرا غم بہت ہی گہرا اور بالکل تازہ تھا۔مجھے موسم اور لوگوں سے کیا لینا تھا۔

کچھ وقت بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ میری ٹانگیں سُن ہو رہی ہیں۔جس کی وجہ سے میں نے اُن پہ نظر دوڑائی، کہ ایک شخص نے میری ٹانگیں زور سے پکڑی ہوئی ہیں اور سر جُھکائے میرے قدموں میں بیٹھ کے رو رہا تھا۔میں نے اُن کا سر اُٹھا کر اُن کا چہرہ دیکھنا چاہا۔جیسے ہی میں نے اُن کے چہرے کو دیکھا، میری آنکھیں غم و غصہ سے بڑی ہو گئیں، میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی، میری سانسیں تیز ہونے لگیں۔میں نے اُن سے اپنی ٹانگیں چُھڑائیں اور میں پیچھے ہو گیا۔کیونکہ وہ ثانیہ کے ابو تھے۔وہ بہت رو رہے تھے اور ہاتھ جوڑ کے ویسے ہی میرے پاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔دل چاہ رہا تھا کہ اُن کو مار مار کہ یہی پہ مار ڈالوں مگر مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اُٹھ سکتا۔میرے چہرے کا رنگ غصے کی وجہ سے لال ہونے لگا تھا۔

اُنہوں نے پھر میرے پاؤں پکڑے اور بولے ''مجھے معاف کر دو بیٹا مجھے معاف کر دو۔میں تمہارا گنہگار ہوں، میں خود تمہارے پاس آیا ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو، تم جو سزا چاہو دے سکتے ہو''۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں ان کے ہجرے گیا تھا اور ان کے پاوں پڑا تھا کہ ثانیہ کو کچھ مت کہنا تب یہ لوگ نہیں مانے تھے اب مجھ سے کیوں معافی کی اُمید رکھ کر آئے ہیں۔میں درد و غم سے کچھ نہ بول پایا۔شاید وہ میری آنکھیں پڑھ سکتا تو جان جاتا کہ اُس میں کیا ہے پھر وہ ایک لفظ اور نہیں کہتا اور چلا جاتا۔

ایک ہاتھ سے اپنے آنسو کو پونچھتے ہوئے کہا ''اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے وہ کہتی ہے کہ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔میں کیا کرتا میں مجبور تھا۔وہ کہتی ہے کہ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کرونگی لیکن اگر تم مجھے معاف کر دو تو وہ ضرور معاف کرے گی''۔

وہ میری آنکھوں کی زبان سمجھ نہ پایا اور مجھ میں بولنے کی سکت نہیں تھی اس لیے میں نے اُن سے منہ موڑ لیا۔

وہ بولتے رہے ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔میں ملامت ہوں، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں، ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں بس مجھے معاف کرو۔اگر تم معاف نہیں کرو گے ثانیہ معاف نہیں کرے گی اور پھر خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔(ہاتھ جوڑتے ہوئے) مجھ پہ رحم کرو، میں ایسے مر بھی نہیں پاؤنگا''۔

اب ان باتوں کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا، مجھے وہ اور برداشت نہیں ہوئے، دل چاہ رہا تھا کہ اس کو دھکے دے کر نکال دوں۔

میں نے پورا زور لگایا اور اُن پہ چلاتے ہوئے کہا ''نکل جاؤ''۔

ہجرہ گھر کے پاس تھا وہاں شہزاد نے میری آواز سن لی تھی اور بھاگ کے ہجرے آیا۔ اُس نے جیسے ثانیہ کے ابو کو دیکھا تو پستول نکالی اور اُنہیں لات مار کر مجھ سے دور گرایا اور کہا ''کس لیے آئے ہو یہاں اسی وقت چلا جاو ورنہ تیری لاش جائے گی''۔

اُنہوں نے پستول کو اپنے ماتھے پہ رکھتے ہوئے کہا ''یہی تو چاہتا ہوں کہ کوئی مار دے مجھے، اتنی ہمت بھی نہیں کہ خود کو گولی ماروں''۔

شہزاد نے اُسے ایک اور لات مارتے ہوئے کہا ''دفع ہو میں تمہارے گندے خون سے اپنے ہاتھ اور اس زمین کو گندہ نہیں کرنا چاہتا''۔

وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا ''میں اسی رویے کے لائق ہوں، مجھے جتنی سزا دی جائے کم ہے، جتنا ذلیل کرو کم ہے، میں اس لیے آیا تھا کیونکہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، مجھے پتہ ہے کہ میں معافی کے لائق بھی نہیں لیکن اگر تم معاف کر دیتے تو مجھ پہ تا مرگ احسان ہوتا اور میں چین سے مر سکتا''۔

میرے لیے فیصلہ بہت مشکل تھا، معاف کروں تو ثانیہ کو بُرا نہ لگے کہ اُس کے گناہ گاروں کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیا اور اگر معاف نہ کروں تو خدا نہ خفا ہو جائے۔ اس وقت نہ مجھ میں سوچنے کی صلاحیت تھی نہ کوئی فیصلہ کرنے کی ہمت۔ شہزاد میرے چہرے کو پڑھ سکتا تھا وہ سمجھ گیا کہ میں اور بھی پریشان ہو گیا ہوں۔

وہ کہنے لگا ''فکر نہ کرو اگلی بار اُن میں سے کوئی نہیں آئیگا۔ چلو گھر چلتے ہیں''۔

میں ویسے ہی کرسی پہ پڑا رہا۔ وہ پاس بیٹھ کر کہنے لگا ''نہ کچھ کھاتے ہو نہ کسی سے بولتے ہو ایسا کب تک چلے گا۔ جو ہو گیا اُس کو کوئی بدل نہیں سکتا لیکن تمہیں دیکھ کر میں بھی خفہ ہوتا ہوں اور سارے گھر والے بھی خفہ ہیں۔ چلو گھر چل کے کچھ کھاتے ہیں مجھے بھی بھوک لگی ہے''۔

اُسے پتہ تھا کہ میں چل نہیں سکتا اس لیے مجھے ہاتھ سے اُٹھا کر کندھا دیا اور ہم گھر روانہ کیا۔ میں پاؤں گھسیٹتے ہوئے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش میں وقت کو واپس لا سکتا۔۔۔

پاگل ایک مہنے بعد اُن کے ہاتھوں قتل ہوا جن کے ساتھ دشمنی مول لی تھی۔

جلال کے ابو پوری طرح پاگل ہو گئے تھے اور کئی سال پاگل پن میں گزار کر مر گئے۔

ثانیہ کے ابو میری اس کہانی کے ختم ہونے سے کچھ مہینے پہلے چل بسے۔

ثانیہ کے خاندان کے اکثر لوگ یا تو قتل ہوئے یا ذہنی مرض کا شکار ہو گئے اور جو ٹھیک تھے وہ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے اُن کا کسی کو نہیں پتہ کہاں گئے۔

یہاں اُن کے خاندان کا کوئی نہیں بچا۔

نعمان ہاسٹل چھوڑ کر چلا گیا لیکن سکول آتا تھا اس لیے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

شیخ، شکیل، جمیل، لقمان، خورشید، عثمان، حسن، حسین اور بہت دوست جن کے نام میں نے اس کہانی میں نہیں لیے سب کے ساتھ آج تک وہی دوستی ہے۔ میں آج اُن سب سے دور ہوں اور اُن کی بہت یاد آتی ہے۔

میں نے ہاسٹل میں پورے تین سال گزارے۔

میں نے مانگی جب بھی دُعا خدا سے
پوری ہوئی ہر ایک مانگ ابتدا سے
تو جو نہ ملی کوئی اور حکمت ہوگی
ورنہ ہم تو لڑ پڑے تھے سارے جہاں سے